میرا بچپن:

میرا نام محمد کفایت اللہ ہے۔ خاندانی حوالے سے قاضی اور مفتی ہوں۔ پیدائش ۱۹۴۳ء، ۱۹۴۴ء کی ہے۔ مہینہ جولائی یا اگست ہے۔ پیدائش کے حوالے سے جو کچھ یہ روایت ہے حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ میں پیدائش کے حوالے سے ہندوستانی ہوں اور میرے آباء واجداد بھی پیدائش کے حوالے سے ہندوستانی تھے۔ ہجرت اور نقل مکانی کے حوالے سے پاکستانی ہوں گویا میں دو وطن کے حوالے سے دو وطنیتوں کا حامل ہوں۔ ایک وطنیت جبری ہے تو دوسری وطنیت بھی آدھی جبری آدھی اختیاری ہے۔ وہ اس طرح نقل مکانی کا فیصلہ تو جبراً ہی میرے ماں باپ نے کیا تھا۔ میں بھی بلا اختیار وارادہ ان کی اتباع کرتے ہوئے ان کے پیچھے چلتا رہا۔ راستے میں گولیوں کی بوچھاڑ اور موسم کی فتادنے میرا ان سے ساتھ چھڑا دیا۔ میں ریاست بیکانیر میں بہنے والی نہر کے کنارے بلا قسمت وبلا زاد وبلا دوست وبلا ہمکار اللہ تعالیٰ کی مشیت قاہرہ سے کسی نہ کسی طرح حدود سرزمین پاک میں رات کی تاریکی وتنہائی اس کا قافلہ میں جا شامل ہوا۔ جسے نہ اپنی اگلی منزل کا پتہ تھا اور نہ ہی اس کا کوئی پرسانِ حال اور رہبر تھا۔ قافلہ کیا تھا مصیبتوں کے مارے ہوئے بے بسی اور بے کس انسانوں کا گروہ تھا جسے پینے کے لئے پانی اور کھانے کے لئے کسی طرح خوراک میسر تھی روتے میں جہاں تالاب یا ٹوئے میں کھڑا پانی مل جاتا تھا بے صبروں کی طرح جانور انسان بچے بوڑھے، مرد وزن اسی پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ قافلہ بھوک وپیاس میں سے برا حال تھا۔ لیکن راستے کی صعوبتوں او عران شہادتوں کی وجہ سے جو ان کی اُنہیں کے سامنے ہوئی تھیں اور ان موتیں جو ان کے عزیز واقارب، ماہتاب بھائی بہنوں کی ہوئی تھیں جن کی تجہیز وتکفین سے بھی عاجز تھے اور جن کی بے وقت موت پر ان کی آنکھیں آنسو بہانے سے بس عاجز تھیں ان سب صدموں نے انہیں ادھ مویا کر دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میری پیاری نانی جو اکثر میرے لئے کھیل کود اور دل بہلانے کے لئے ہزار جتن کیا کرتی تھیں جو مجھے کھیلتے دوڑتے اور کانے کے گھوڑے کو دوڑتے دیکھ کر خوب ہنسا کرتی تھیں وہ پورے قافلے میں چپ سادھ چکی تھیں وہ بولنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ میری والدہ ماجدہ جو انہی ماں کی سب سے چھوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی لاڈلی بیٹی تھیں ہو اپنی ماں کا دل بہلانے کے لئے ہزار ہا جتن کر کے آخر کار عاجز آ کر خود بھی خموشی اختیار کر چکی تھیں۔ نانی کی زبان پر یہی کلمات تھے کہ ہمارے مدرسہ ومسجد کا کیا بنے گا۔ ہم سے ہماری وہ فقہ وحدیث کی کتابیں وہ قرآن پاک اور ان پاکیزہ تفسیریں۔ وہ میرے بزرگوں کی بیاضیں اور ان کی مسندیں وعلم وعرفان کے خزینے جنہیں ہم اپنے ساتھ نہیں لا سکے ان کا کیا بنے گا۔ پھر وہ ہماری مرکزی بڑی جامع مسجد جس میں ہمارے آباؤ اجداد صبح وشام قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند کیا کرتے تھے اس کا کیا بنے گا وہ مسجد کا بیرونی چوبوترہ جس پر نماز فجر کے بعد مسلمان خواتین ہی نہیں ہندو اور سھ خواتین بھی اپنے بچوں کو لا کر دم کروایا کرتی تھیں۔ جو ہمارے بزرگوں کو میاں جی کہہ کر ان سے دعائیں کرایا کرتی تھیں۔ اب جب فجر کا وقت ہوا کرے گا تو ہو چبوترہ کب تک خواتین کا انتظار کیا کرے گا اور جب خواتین نہیں آئیں گی تو چبوتے اور ان درودیوار پر کیا گزرے گی اور ہاں میرے فاضلِ اجل بیٹے میرے لعل میرے ضیاء الدین کو کیا ہوا۔ وہ آج اس قافلے میں مجھے کہیں نظر نہیں آرہا۔ وہ تو مجھے گھر سے باہر تنہا نہیں جانے دیا کرتا تھا۔ آج اسے کیا ہوا کہ ان جنگلوں میں بے یارومددگار پھر رہی ہے کیا اس نے مجھے بھلا دیا ہے یا وہ کسی ایسی دنیا میں جا بسا ہے جہاں کسی کو واپس کرنے اور پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رشتہ وناطہ رکھنے کی اجازت نہیں۔

میری نانی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کا لاڈلا ہندوں اور مسلمانوں کے باہمی ظالمانہ تعصب کا شکار ہو چکا ہے وہ ظالم و بے ایمان گورے بدکار و بدنہاد انگریز کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلایا جا چکا ہے۔ جس کی لاش تو کجا اس کی راکھ اور خاک کا بھی کوئی نشان باقی نہیں چھوڑا گیا۔ جسے دیکھ کر اس کی ماں غرضیکہ کہ آہ وفغاں کرتے کرتے میری نانی مجھے تنہا چھوڑ کر اپنے عزیز و حبیب بیٹے کے پاس چلی گئی۔ میرے سامنے میری نانی کا بے روح بدن پڑا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ فوت ہو گئی ہے زیادہ سے زیادہ مجھے یوں لگا جیسے وہ دکھوں اور تکلیفوں کے ناقابل برداشت بوجھ سے تھک کر سڑک ہی کے کنارے سو گئی ہے۔ میں نے اپنی ماں کو زار و قطار روتے دیکھا۔ رونے کی وجہ معلوم نہ تھی۔ اگر وجہ معلوم ہوتی تو شائد میں انہیں چپ کرانے کی کوشش کرتا۔ لیکن وجہ مجھے معلوم نہ تھی۔ میرے والد دادا اور دیگر عزیز و اقارب میں اپنے اپنے مردوں کو لے کر بیٹھے تھے۔ سوچ رہے تھے کیا کریں۔ تجہیز و تکفین اور دفنانے کا انتظام کیسے کریں۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ انہیں ایک لائن میں رکھ کر اجتماعی جنازہ ادا کر دیا جائے۔ لیکن دفنائیں کیسے نہ کدال نہ کسّی نہ کھرپا نہ برچھی، زمین کھودیں تو کس طرح۔ آخر کار ارد گرد دوڑنا شروع کر دیا کہ شاید کوئی نشیبی زمین مل جائے تو اس نشیب میں رکھ کر اوپر سے ہاتھوں سے مٹی کھود کر ان پر ڈالنے کی کوشش کریں۔ آخر وہی ہوا میری نانی کے جسد اطہر کو ایک نشیبی گڑھے میں رکھ دیا گیا مجھے یاد ہے میری والدہ ادھر ادھر سے مٹی کے ڈھلے اُٹھا اُٹھا کر لا رہی تھیں اور میں بھی اپنے ننھے و ناتواں ہاتھوں میں ڈھیلے اُٹھا اُٹھا کر اپنی والدہ کی مدد کر رہا تھا۔ وہ منظر ہر وقت آج تک میری آنکھوں سے اوجھل بلکہ اس منظر کا وہ لمحہ کہ جب میری والدہ اس غم سے نڈھال ہو کر گر پڑیں اور انہیں خون کی الٹی آئی۔ پتہ چلا کہ اس سارے منظر نامے نے چند دنوں میں ان کے پھیپھڑوں کو زخمی کر دیا ہے غرضیکہ ہم اپنے ان شہداء کو بے گور و کفن دھرتی ماتا کے سپرد کر کے بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ نہ منزل معلوم تھی اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ اب اس بے سمت سفر کا راہنما کون ہے۔ ادھر اُدھر لوگوں سے پوچھتے پوچھاتے کہ کہیں ہمارے سر چھپانے کا کوئی سامان میسر ہو سکتا ہے تو بتائیں۔ ہر ایک کا جواب تھا ہم تو خود گاس پھوس کے جھونپڑوں میں سر چھپائے بیٹھے ہیں اگر آپ ہمارے پاس یا ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہیں تو ہمارے پاس آجائیں ورنہ آگے قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں' تو سو بسم اللہ ایسا کر کے دیکھ لیں۔ آخر کار بزرگوں نے یاد کیا کہ ریاست بہاولپور کے فلاں گاؤں والوں کے ساتھ کوئی دور کا رشتہ بنتا ہے۔ چلو وہاں چل کر دیکھتے ہیں۔ کیا ہوتا ہے اب ہمارا قافلہ ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ ہر ایک خاندان اپنی جان پہچان والوں کو یاد کر کے انہیں پوچھتا پوچھاتا اس کی طرف منہ کر کے اللہ توکل کر کے چل پڑا۔ ہم بھی چلتے رکتے۔ گرتے پڑتے ایک دوسرے کا سہارا بنتے اور سہارا دیتے بھوکے پیاسے ٹویوں کے پانی پینے سے پیاس بجھاتے اور راستے میں اگر کوئی گاؤں آیا یا وہاں سے اگر کوئی دوسرا روٹیوں کا انتظام ہو جاتا تو اسے آپس میں بانٹ لیتے۔ آخر کار کئی دنوں کی مسافت طے کر لینے کے بعد ایک گاؤں پہنچے۔ پتہ چلا کہ اس گاؤں والے بھی ہماری تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ ہمارے ایک ماموں کی اس گاؤں میں غالباً شادی ہوئی تھی۔ اور گاؤں والوں کی ہمارے ماموں کے سسرال سے کوئی قریبی رشتہ تھا اور اچھی خاصی جان پہنچان تھی جبہم اس گاؤں میں اترے تو ہمیں پہلی دفعہ کھانے کو روٹی اور پینے کو ملا۔ لیکن ہم کافی بڑی تعداد میں تھے۔ اتنے زیادہ افراد کو دن رات کھانا کھلانا کافی مشکل کام تھا۔ مزید براں مسئلہ یہ بنا کہ میرا چھوٹا بھائی جس کا نام حمد اللہ تھا وہ بیچارہ پہلے ہی سے نحیف و نزار تھا اور اس ضعف کی وجہ سے اس کے لئے چلنا کافی مشکل تھا۔ پھر اس جلاوطنی و مہاجرت اور اس بے سر و سامانی

کے عالم میں جنگلوں کی آوارہ گردی نے اسے مزید کمزور کر دیا تھا۔ ہمیں اس گاؤں میں اترے ہوئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ وہ فوت ہو گیا۔ مجھے تو ابھی تک معلوم نہ تھا کہ موت کیا ہوتی ہے بس اتنا یاد ہے کہ والد صاحب اسے ایک پیڑھی میں ڈال کر اور کپڑے میں لپیٹ کر مسجد میں لائے۔ ان کے لئے نماز جنازہ پڑھی گئی لوگوں کے سامنے وہ کہہ رہے تھے کہ اسے قبرستان میں جا کر دفن کر آئیں۔ والدہ پہلے ہی غموں سے نڈھال تھی رہی سہی سکت اس بیٹے کی بے سرو سامانی کی موت نے ختم کر دی۔ چند دنوں کے بعد اس گاؤں سے بھی کوچ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ایک گدھے پر کپڑے ڈال کر والدہ کے پیچھے اسی گدھے پر سوار ہو کر کسی دوسرے گاؤں میں پہنچائے گئے۔ لیکن ایک دو دن کے بعد ہی وہاں سے دل اکتا گیا پھر دوبارہ اس جیسے گدھے پر رختِ سفر رکھ کر اسی گاؤں میں دوبارہ وارد ہوئے ایک دو دن کے بعد ایک دوسرے گاؤں کا ارادہ کیا کیونکہ پتہ چلا کہ وہاں پر ہمارے دادا کے چھوٹے بھائی اپنی آل اولاد کے ساتھ سکونت پذیر ہو گئے ہیں والد والدہ چچا اور دادا کے ساتھ پیدل چلتے چلاتے اُس گاؤں پہنچے۔ گاؤں کیا تھا۔ چند گھاس پھوس کے جھونپڑے تھے لیکن چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی اور اس کی آل اولاد کا پورے اکرام اور اعزاز کے ساتھ استقبال کیا اور جو روکھی سوکھی ان کے پاس تھی اس میں ہمیں خوش دلی کے ساتھ شریک کر لیا پتہ چلا کہ اس علاقے میں سانپوں کی بھرمار ہے لہٰذا زمین پر سونا نہایت خطرناک ہے لہٰذا اِدھر اُدھر سے درخت کاٹ کر ۵، ۴ فٹ اونچے چھپر بنا لئے گئے تا کہ رات کو ان پر سویا جائے۔ ہم بچے خود ان چھپروں پر چڑھ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ ہماری نسبت سے کافی اونچے تھے ہمارے بزرگ ہمیں ان پر چڑھا دیتے اور وہی ہمیں صبح ان سے اتار لیتے باوجود اس کے کہ ان کے اوپر کچھ بچھانے کے لئے ہمارے پاس نہ تھا اور ہم ان چھپروں پر بلا کسی بستر کے لیٹ جاتے تھے لیکن نیند خوب آتی تھی کیونکہ مسلسل حالتِ سفر میں ہونے کی وجہ سے نیند کوئی مسئلہ نہ تھی۔ جونہی ہم ان پر لیٹتے فوراً نیند کی آغوش میں جا پہنچتے۔ پھر جب تک کوئی ہمیں اچھی طرح نہ جگاتا ہم اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ کئی دن یا شاید ایک دو ماہ کے گذر جانے کے بعد ہمارے دادا کے چھوٹے بھائی نے اپنے بڑے بھائی یعنی ہمارے دادا جی سے کہا کہ بھائی جان اب پچھلا ماحول تو ملنے سے رہا لہٰذا اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ جیسے کیسے کہیں کوئی رہائش کا انتظام ہو جائے وہاں سر چھپانے کا انتظام کر لیا جائے۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ چند میل کی مسافت پر پانچ چھ چھوٹی چھوٹی قریب قریب آبادیاں ہیں انہوں نے ہم سے کہا ہے کہ ہم ان کے لئے کسی قسم کا انتظام کر دیں۔ ہم نے سوچا ہے کہ آپ لوگوں کو وہاں بطور معلم قرآن رکھوا دیں وہاں کوئی نہ کوئی مسجد ہو گی وہاں پر آپ امامت کے فرائض اگر انجام دے دیا کریں تو یہ مزید آپ کے لئے بھی اور ان کے لئے بھی اجر و ثواب کا باعث بنے گا۔ آخر کار ہم تمام گھر والے ایک دوسرے چھوٹے سے گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ وہاں پر تعلیم قرآن کا ابھی ابتدائی کام ہی شروع ہوا تھا کہ ہمارے چچا اس ماحول سے اکتا گئے۔ انہوں نے مڈل سکول کا امتحان پاس کیا ہوا تھا۔ انہوں نے ہمارے اس گاؤں سے اکتا کر ریاست بہاولپور سے پنجاب وارد ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں مہاجرین سے غالباً ریل کی سواری کا کرایہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اسی لئے وہ قریب کے ریلوے اسٹیشن سے پنجاب کے لئے سوار ہو گئے۔ پھر وہ دو ڈھائی ماہ کے بعد واپس آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ہمارے لئے مہاجر ہونے کی بنیاد پر کچھ زمین الاٹ کرا چکے ہیں۔ وہ گاؤں بھی بڑا ہے اور اس میں سکول بھی موجود ہے لہٰذا بچے وہاں سکول میں تعلیم بھی حاصل کر سکتے ہیں آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ ریاست سے پنجاب کی طرف منتقل ہوا جائے۔ ہم ایک دو دن کے لئے دوبارہ اپنے چھوٹے دادا جی کے گاؤں

پہنچے۔ ایک دو دن قیام کر کے اور ان سے اس معاملے پر گفتگو کر لینے کے بعد ان کی بھی رضامندی حاصل ہو گئی اور ہم پیدل وہاں سے چل پڑے۔ چلتے چلاتے ہم دریائے ستلج کے کنارے پر پہنچے۔ وہاں پر جب پہنچے تو رات ہو چکی تھی، ملاح کشتی کو لنگر کے ساتھ باندھ کر گھر جا چکا تھا۔ اس نے صبح آنا تھا لہٰذا ہم اس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ خدا خدا کر کے وہ رات گذاری صبح ہوئی۔ ملاح آیا اور اس نے ہمیں کشتی میں سوار کر کے دریا کے دوسرے کنارے پر جا اُتارا۔ وہاں سے ہم نے پاکپتن پہنچنا تھا۔ لہٰذا پیدل مارچ کرتے ہوئے ہم شام سے ذرا پہلے پاکپتن پہنچ گئے۔ وہاں جب پہنچے تو خاندان کے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ حضرت فرید الدین مسعود کے مزار پر حاضری دی جائے، وہاں فاتحہ پڑھی جائے۔ کیونکہ ہمارے بڑے بزرگ انہیں کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اس احسان شناسی کے نتیجہ میں ہمارے خاندان کے تمام افراد مزار کی طرف چل دیئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو والد صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مزار کی طرف لے چلے اور حاضری دینے کے لئے کہا۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ میں نے مزار پر حاضری دینے سے پوری شدّت کے ساتھ انکار کر دیا۔ اور والد صاحب نے مجھے پوری قوت کے ساتھ زور لگا کر مزار کی طرف آگے بڑھنے کو کہا۔ لیکن میں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میں مزار پر جا کر حاضری نہیں دوں گا اور نہ ہی وہاں جا کر کوئی دعا کروں گا۔ والد صاحب نے غصّے میں آ کر مجھے زور کا تھپڑ مارا اور مجھے روتا ہوا چھوڑ کر آگے مزار کی طرف بڑھ گئے۔ کافی دیر کے بعد تمام بزرگان خاندان واپس آئے تو میں نے بلند آواز سے انہیں کہہ سنایا کہ آپ لوگ خالی ہاتھ گئے تھے اور خالی ہاتھ واپس آ گئے ہو۔ بزرگ نے تمہیں کیا دیا بلکہ اُن کے پاس کیا کوئی تھا کہ وہ تمہیں دے سکتے۔ والد صاحب میرے ان الفاظ پر سخت ناراض ہوئے قریب تھا کہ وہ میری دوبارہ پٹائی کر دیتے لیکن دادا جان نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں نے لے لیا اور انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم نے معصوم بچے کو پہلے بھی مارا ہے اور پھر مارنا چاہتے ہو آخر کیوں؟ بتاؤ اس معصوم بچے نے کیا جرم کیا ہے کہ جس کی تم اسے سزا دینا چاہتے ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ اس معصوم بچے کو کیا معلوم کہ بزرگ کون ہوتے ہیں یا یہ بزرگ کون ہیں اور ان کی کیا خدمات ہیں۔ اور ان کے مزار پر جانے کی کیا ضرورت و اہمیت ہے اور کیا نہیں۔ پس آئندہ تم میرے اس بیٹے کو ہاتھ نہ لگانا۔ اسے اس امر کی پوری آزادی حاصل ہے اس حوالے سے وہ کیا کرے یا کیا نہ کرے اس کے عاقل بالغ ہونے تک ہم اس پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتے لہٰذا اس کے عاقل بالغ ہونے کا انتظار کرو اس کے بعد اسے سمجھانا اگر اسے سمجھ میں آ گیا تو فبھا ورنہ اس پر جبر کرنے کا ہمیں کوئی اختیار حاصل نہیں ہو گا۔

آخر کار ہم پاکپتن سے اگلی منزل کی طرف چلے یہ وہ گاؤں تھا جس میں ایسے لوگ رہتے تھے جو ہمارے ہاں مشرقی پنجاب میں اپنے جانور چرانے کے لئے آیا کرتے تھے اور اسی حوالے سے ہمارے بزرگوں کی ان سے رشتہ داری بھی ہو گئی تھی۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے ہمارے لئے ایک کوٹھے میں ہمارے لئے عارضی رہائش کا انتظام ہو گیا۔ اور گذر اوقات کے لئے کچھ زمین پہلے ہی الاٹ ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی ہم اس گاؤں میں اپنے پاؤں بھی نہ جما پائے تھے کہ اچانک ہمارے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ہوا یوں کہ میرے والد صاحب ایک دوکان سے ڈھائی من کی ایک گندم کی بوری خریدی۔ انہوں نے اتنی وزنی بوری کو اپنے سر پر اُٹھا لیا اور گھر کی طرف چل پڑے۔ جب وہ اتنے زیادہ وزن کے ساتھ گھر پہنچے تو انہوں نے کسی اور کی مدد کا انتظار کیے بغیر اس وزنی بوری کو زمین پر دے مارا۔ اس عمل کے دوران اُن کی گردن میں کوئی ایسا بل پڑ گیا کہ جس کے نتیجے میں اُن کی حلق سے خوراک تو کجا دوا یا

پانی جیسی سیال چیز کا بھی پیٹ یا معدے میں جا پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ اگر کوئی بڑا شہر یا قصبہ ہوتا جس میں کسی میڈیکل ایڈ کا مل سکنا ممکن ہوتا تو شاید فوراً اس کا کوئی علاج ہو سکتا۔ لیکن ایسے دُور دراز گاؤں میں ایسا کوئی انتظام کر سکنا ناممکن تھا۔ وہاں صرف ایک حکیم صاحب تھے جو دیسی ادویہ سے زیادہ انگریزی ادویہ کے ساتھ علاج کیا کرتے تھے۔ اور یہ مسئلہ کسی حکیم یا ڈاکٹر سے زیادہ سرجن کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا دو تین دن کی تکلیف کے بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ لیکن میں ابھی تک جس عمر کے مرحلہ سے گذر رہا تھا اس میں میں ابھی موت و حیات کے راز سے آشنا نہ ہوا تھا۔ لہٰذا جب والدہ اور دیگر خواتین کو میں نے روتے دیکھا تو میں اُن کے رونے کے راز سے آگاہ نہ ہو سکا۔ مجھے تعجب تو ہوا لیکن میں کسی سے پوچھ نہ سکا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں۔ بہر حال میں نے والد صاحب کو غسل دیتے دیکھا انہیں پہنایا جانا بھی مجھے یاد ہے۔ اور مجھے یاد ہے کہ اُن کی میّت کو آگے رکھ کر اُن پر نمازِ جنازہ کب اور کہاں پڑھی اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں دادا جی کے ہمراہ قبرستان تک گیا اور والد صاحب کو لحد میں اُتارتے دیکھا۔ لیکن میں بالکل نہ سمجھتا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے بہر حال کافی رات گذرنے کے میں دادا جی کے ساتھ گھر واپس آیا اور جہاں تک مجھے یاد پڑھتا ہے اُس رات ہم بغیر کچھ کھائے پیے سو گئے۔ میں نے نہ دادا جی کو روتے دیکھا اور نہ ہی آنسو بہاتے دیکھا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ جب والد صاحب کو لوگ لحد میں اتار رہے تھے تو دادا جی نے ایک منٹ کے لئے اپنا رُخ دوسری طرف پھیرا۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ ایک دو آنسو اُن کی آنکھوں سے بہہ چکے ہیں جنہیں انہوں نے فوراً ہی اپنے ہاتھ سے پونچھ لیا تھا۔ پھر اُس کے فوراً بعد آپ نے اپنے حافظِ قرآن بیٹے کو لحد میں اتارنے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ جب لحد میں اتارے جانے کے بعد قبر پر مٹی ڈال کر اور اسے ذرا اُونچا کر کے اس کی مخصوص صورت میں ڈھال دیا گیا تو دادا جی ہر اس شخص کے ساتھ جو والد صاحب کی وفات پر اُن سے تعزیت کا اظہار کر رہا تھا اور میرے سر پر شفقت سے اپنا ہاتھ پھیر رہا تھا اسے یہی فرماتے سنا کہ بھائی یہ میرا بیٹا میرے مالک و مولا کا عطا کردہ تھا جس نے اُسے ہمارے پاس بھیجا اُسی نے اُسے ہم سے واپس بلا لیا۔ پس ہمارے لئے صبر و شکر کے سوا کیا چارا ہے۔ ہاں میرے پاس میرے اس مرحوم حافظِ قرآن بیٹے کی یہ پوتا نشانی ہے میں اپنے مولا کریم سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میرے اس پوتے کو اپنے والد کا صحیح معنوں میں جانشین بننے کی توفیق عطا کرے گا۔ اسے قرآنی علوم و معارف کا عالم فاضل بننے کی توفیق عنایت فرمائے گا۔ یہ اپنے باپ کے علوم و معارف کا ہی وارث نہیں بنے گا بلکہ اپنے عظیم نانا اور اپنے فاضل ماموؤں جو کہ بہت بڑے علامے تھے اُن کا بھی والی و وارث بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے لمبی عمر اسے صحت و سلامتی عطا کرے گا اس کے لئے علوم و معارفِ قرآنیہ کی تحصیل کی کٹھن منزل کو آسان کرے گا اور ان کے حصول کے لئے مشکل ترین راستوں اور صعوبت بھری راہوں پر چلنے کے لئے اسے آسانیاں بہم پہنچائے گا۔ غرضیکہ اس طرح کی نیک تمناؤں اور دعاؤں کا اظہار کرتے ہوئے مجھے انگلی پکڑے گھر واپس تشریف لائے۔ میری والدہ نہایت افسوس کی حالت میں بیٹھی تھی اُنہیں اپنے خاوند کی اس بے وقت وفات نے اپنے وفات یافتہ بھائیوں اور والدہ سب کی یاد تازہ کر دی تھی۔ یونہی میں اُن کے پاس پہنچا انہوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ فرمانے لگیں کہ تیرے والد جو حافظ قرآن تھے وہ اپنے مولا کریم کے پاس جا چکے ہیں میں بھی دعا کرتی ہوں اور ساتھ عہد بھی اگر میں زندہ رہی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے لمبی عمر عطا کی تو میں تجھے تیرے والد کی طرح قرآنِ کریم کا نہ صرف حافظ بناؤں گی بلکہ تجھے قرآنی علوم و معارف کا عالم بھی بنانے کی کوشش کروں گی۔ میری انتہائی تمنا ہو گی کہ تم علوم و معارف

قرآنیہ کو جہاں تک تم سے ممکن ہو سکے دنیا جہاں میں انہیں پھیلانے کی کوشش کرنا اور زیادہ سے زیادہ انہیں مخلوقِ خدا تک پہنچانے کی اللہ تعالیٰ سے توفیق و عنایت کی دعا کرتے رہنا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تو اپنے عظیم نانے کی طرح بہت بڑا علامہ اور خطیبِ اسلام بنے گا۔ میری تمنا یہ بھی ہے کہ خدا تجھے میرے مرحوم بھائی غلام احمد کی طرح ذہین و فطین بنائے اور علومِ اسلامیہ کے سیکھنے سکھانے میں تجھے کامیاب کرے۔ مجھے یاد ہے کہ میرا یہ مرحوم بھائی تجھے اپنی گود میں بٹھا کر اکثر مجھے یہ کہا کرتا تھا کہ اے میری پیاری آپا غلام جنت فاطمہ مجھے تو آپ کا یہ بیٹا بڑا ذہین نظر آتا ہے۔ اس کی شکل و صورت میں علامہ زماں کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ یہ میرا بھانجا اپنے نام کی طرح صحیح معنوں میں کفایت اللہ بنے گا۔ غرضیکہ والدہ محترمہ اپنے ماں باپ اور مرحوم بھائیوں کو کافی دیر تک یاد کرتی رہی اور مجھے اُن کا مثیل اور مصداق بننے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں گزارتے گزارتے سو گئیں۔ چند دنوں کے بعد ہی ہمیں اس کوٹھے کو خالی کر دینے کو کہا گیا یہ کوٹھا نسبتاً کچھ بہتر تھا۔ اس کے بعد ہم ایک ایسی جھگی میں رہائش رکھنے پر مجبور ہو گئے جہاں چوہوں کی بھرمار تھی اور جب بارش ہوتی تو اس کی چھت ٹپکنے لگتی۔ اس ٹپکنے سے جھگی کے اندر کا حصہ بارش کے پانی سے بھر جاتا۔ والدہ نے اس جھگی کے عین وسط میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود رکھا تھا جیسے ہی پانی اس میں جمع ہوتا میں ایک کولا ہاتھ میں پکڑ کر اس پانی کو باہر پھینکنا شروع کر دیتا۔ بہر حال ابھی اسی جھگی میں آئے ہوئے ہمیں کوئی زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ اچانک شدید سردی کا موسم آ پہنچا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ والدہ نے مجھے ایک کنستر یا پیپا سر پر رکھنے کو کہا۔ والدہ نے کپڑوں کی گٹھڑی ہاتھ میں لی اور اس پیپے میں کچھ کپڑے ڈال کر اسے میرے سر پر رکھ دیا۔ گاؤں سے متصل ایک کھالا بہا کرتا تھا جو غالباً ابھی تک وہاں رواں دواں ہے۔ مجھے اس پیپے کے نیچے آگ جلانے کو کہا گیا۔ اور والدہ نے کوئی سفید سا مادہ اس میں اُنڈیل دیا۔ جب پانی اُبلنے لگا تو انہوں نے اس میں کپڑے ڈال دیئے۔ پھر اس میں سے نکال کر ایک ایک کپڑے کو دھونے لگی۔ پھر میں ایک ایک کپڑے کو ڈال کر خشک ہونے کے لئے قریب ہی خشک گھاس پر ڈالنے لگا۔ یہ کپڑے دھوتے دھوتے عصر کا ٹائم ہو گیا۔ یہ جنوری کے مہینے کا پہلا ہفتہ تھا۔ کچھ دن کے بعد والدہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور قریب کے ایک گھر میں لے گئیں۔ وہاں انہوں نے گھر والی خاتون سے ایک چارپائی مانگی۔ میں اور میری والدہ اس چارپائی کو اٹھا کر اس کھالے کے پاس لے آئے۔ والدہ نے اس کے اوپر چادر ڈال کر پردہ کر دیا تاکہ وہ نظر نہ آسکیں اور مجھے ایک سائیڈ پر بیٹھنے کا حکم دیا اور فرمایا جب تک میں آواز نہ دوں نہ میری طرف دیکھنا نہ خود میری طرف آنا نہ کسی دوسرے مرد یا عورت کو ادھر آنے دینا۔ غرضیکہ کہ والدہ جلد ہی نہا کر فارغ ہو گئی۔ ہم نے سوکھ جانے والے کپڑوں کو سمیٹا۔ کچھ والدہ نے گٹھڑی باندھ کر اُٹھا لئے اور کچھ پیپے میں ڈال کر میرے سر پر رکھ دیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور ہم ان کپڑوں کو لے کر اپنی جھگی میں جا پہنچے۔ رات جو کچھ ملا اسے کھا لیا اور جلد ہی تھکاوٹ کی وجہ سے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ جونہی مجھے جاگ آئی تو میں نے والدہ کے جسد اطہر کو چھوا تو مجھے پتہ چلا کہ انہیں کپکپی کے ساتھ شدید قسم کے بخار نے آپکڑا ہے۔ اُن کا جسد اطہر بخار کی شدت سے انتہائی طور پر تپا ہوا تھا۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ رات کو ناہنجار چاہوں نے اُن چہرہ انور کو کئی جگہوں سے کاٹ کھایا ہے۔ مجھے ان نہوست زدہ چوہوں پر بڑا غصہ تو آیا مگر رات کی تاریکی کی وجہ سے میں اُن کا کسی طرح کا تعاقب نہ کر سکا اور نہ ہی والدہ کی اس تکلیف کا

مداوا میرے پاس موجود تھا۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا اس تکلیف کا نام بخار ہے۔ اور نہ ہی میں اس امر سے آگاہ تھا کہ اس جیسی تکلیف سے ازالے کے لئے ڈاکٹر کے پاس جانا سود مند ہوا کرتا ہے۔ میں صرف اتنا کر سکا کہ میں والدہ کے ساتھ اور بھی شدت کے ساتھ چمٹ گیا۔

اس عزم کے ساتھ چمٹا کہ اب اگر کوئی چوہا قریب آیا تو میں اسے اپنے ڈنڈے سے جو کہ میں نے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا مار دوں گے۔ بہر حال والدہ کی سانس کی آواز میں کافی واضح طور پر سُن رہا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ اس آواز میں یہ شدت کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ایسی حالت میں کیا دوا دی جائے یا کس شخص کو بلایا جائے تا کہ وہ آ کر تیمار داری بھی کرے اور مریضہ کے لئے اس طرح کسی حد تک تسلی کا سامان فراہم کر سکے۔ پھر یوں ہوا کہ میں جاگتے جاگتے والدہ کے سینے سے چمٹتے ہوئے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ یونہی میں نیند کی آغوش میں پہنچا تو اچانک میں نے والدہ کو تکلیف کی حالت میں کراہتے ہوئے پایا۔ پھر جونہی انہوں نے کچھ افاقہ محسوس کیا تو یوں فرمایا کہ اے بیٹے میں تجھے اللہ تعالیٰ کے امان کے سپرد کرتی ہوں۔ بیٹا اللہ حافظ اللہ تعالیٰ تجھے مصائبِ زمانہ سے محفوظ رکھے اور اگر وہ تجھے آئیں تو تُو اُن کا مقابلہ کرنے اور ان سے نکلنے کے لئے پورے عزم و ارادے اور قوت و طاقت سے اُن سے نجات پانے میں کامیاب ہو سکے۔ مزید آخری الفاظ جو میں نے سُنے وہ یہی تھے کہ بیٹے اللہ حافظ۔ میں اُن کے ان الفاظ کو سُن کر یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ یہ الفاظ کیوں اپنی زبان سے نکال رہی ہیں۔ مجھے از حد حیرانگی ہو رہی تھی کہ والدہ ایسے الفاظ کیوں بول رہی ہیں کہ جن کے مفہوم و معنی سے میں نا آشنا ہوں۔ بہر حال اس سب کے باوجود مجھ پر نیند غالب آ گئی اور جب میں صبح کے وقت اُٹھا تو میں نے دیکھا کہ والدہ نہایت پر سکون طریقے سے سو رہی ہے اور یوں گمان ہوا کہ دکھ درد کی وجہ سے جو آوازیں نکل رہی تھیں وہ بالکل بند ہو گئی ہیں اور انہیں نہایت پر سکون نیند آ گئی ہے۔ میں اسی سوچ و بچار میں مبتلا تھا کہ اچانک میں نے ایک معمر خاتون کو اپنی جھگی کی طرف قدم بڑھاتے دیکھا وہ نہایت وقار سے قدم اُٹھاتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہی تھی اور واضح طور پر صبح کے آثار ہو چکے تھے۔ اسی دَوران کہ جب ہو ہمارے بالکل قریب پہنچ گئی تو انہوں نے کسی کا انتظار کئے بغیر والدہ کے چہرۂ انور سے لحاف دُور کیا اور اُن کے جسدِ اطہر کو چھونا شروع کر دیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ انہوں نے میرے ساتھ کوئی بات چیت نہ کی بلکہ جس خاموشی اور وقار کے ساتھ وہ تشریف لائی تھی اسی طرح وہ ہمارے ہاں سے واپس چلی گئی۔ ابھی اُن کے جانے پر چند لمحات ہی گذرے تھے کہ بہت سی خواتین ہماری جھگی کی طرف آتے دکھائی دیں۔ کچھ کے چہرے تو میرے لئے شناسا شناسا تھے لیکن کچھ میرے لئے اجنبی تھیں اور میں اُنہیں بالکل نہیں پہچانتا تھا۔ ان خواتین میں سے بعض کی آنکھوں میں مجھے آنسو تیرتے نظر آئے اور کچھ نے مجھے میرے پاس آ کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ ایک دوسری خاتون نے کہا کہ جلد ہی مسجد میں جا کر استاد صاحب یعنی میرے دادا جی کو اطلاع کر دینی چاہئے کہ اُن کی بہو کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن ایک دوسری خاتون نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ فجر کی جماعت ہو لینے دیں تا کہ اُس میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ جب فجر کی جماعت ہو جائے تو پھر مسجد میں جا کر اُستاد صاحب کو اطلاع دینی چاہئے۔ ان میں سے بعض خواتین نے دادا جی کو اطلاع کرنے کے لئے مسجد کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا اور کچھ میرے ہی پاس جھگی میں رُک گئیں اُن میں سے ایک خاتون نے دوبارہ میری والدہ کے چہرۂ انور سے لحاف اُٹھا دیا اور انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ اسی دَوران دادا جی نہایت بوجھل قدموں کے ساتھ میری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جونہی آپ جھگی میں داخل ہوئے تو میری والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ

فرمایا کہ بیٹے ابھی تو تیرے اپنے بچے چھوٹے چھوٹے تھے اور ایک سال پہلے اُن کا والد اُنہیں تنہا چھوڑ کر جا چکا ہے تجھے اتنی جلدی ان معصوم اور ناتواں بچوں کو تنہا چھوڑنے کی کیا ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ الفاظ بے ساختہ طور پر اُن کے منہ سے نکل گئے ہیں۔ پھر اگلے ہی لمحے شاید اُنہیں یہ خیال آیا کہ ایسے کلمات کے اظہار سے صبر و شکر کی کیفیت کے زائل ہونے کا احساس ہوتا ہے لہٰذا جلد ہی انہوں نے اپنی اس حالت پر قابو پا لیا اور نہایت پُر سکون حالت میں آ گئے۔ والدہ کے چہرۂ انور کو دیکھ لینے کے بعد وہ میری طرف رُخ کر کے مجھے یوں مخاطب ہوئے کہ اے بیٹے خدا کرے کہ میں تجھے اتنی جلدی چھوڑ کر نہ چلا جاؤں خدا تعالیٰ مجھے توفیق دے کہ میں اُس وقت دنیا سے جاؤں جب تجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا دیکھ لوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ایسا لمحہ تھا کہ جس میں انسانوں کی دعائیں قبولیت کا شرف حاصل کر لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک لمبی اور بابرکت عمر پائی اور انہوں نے مجھے علم و فضل کے حصول میں کامیاب ہوتا بھی دیکھ لیا۔ حتیٰ کہ میں اُن کی وفات، حسرتِ آیات سے پہلے تیس سال کی عمر سے تجاوز کر چکا تھا۔ والدہ وفات سے پہلے اکثر اس امر کا اظہار کیا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ میرے بعد میرے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی حفاظت فرمائے اور انہیں اپنی حفاظت کے سایوں میں پلنے اور بڑھنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ جب دادا جی جگھی سے باہر گئے تو یہ فرما کر گئے کہ وہ گورکن کے گھر جا رہے ہیں تا کہ ان کے لئے ظہر کے فوراً بعد قبر تیار کر لے۔ خواتین نے یونہی گورکن اور گور کے الفاظ سنے تو انہوں نے بے پناہ انداز میں میرے ساتھ محبت و شفقت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ میں ابھی تک اس امر سے مانوس نہ ہوا تھا اور نہ ہی باخبر کہ موت کس کو کہتے ہیں اور وفات کس چیز کا نام ہے۔ اور اس سے انسانوں کے باہمی تعلقات پر کیا کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ چھوڑی دیر میں ایک خاتون نے یوں کہا کہ میں فلاں کمہار کے گھر جاتی ہوں تا کہ وہ دُوسرے گاؤں میں چلا جائے جہاں ہمارے دوسرے عزیز و اقارب ہندوستان سے آ کر سکونت اختیار کر چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں پتہ چلا کہ پیغام رساں دوسری آبادیوں کی طرف روانا کیے جا چکے ہیں۔ میرا اُس دن عجب حال تھا کہ میں والدہ کی قرب سے کسی قیمت پر جدا نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن میری نادانی کا یہ عالم تھا کہ جونہی میں نے ماحول میں دھوپ دیکھی تو فوراً دھوپ میں جا بیٹھا بلکہ میں دھوپ میں بیٹھ کر قریب ہی پڑی گیلی مٹی اور ریت سے گھروندے بنانے لگا اور میں اس حد تک اس میں مشہور ہو گیا کہ مجھے کچھ خبر نہ رہی کہ میرے دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے اور مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میری والدہ مجھ سے آج ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکی ہے۔ میں ان گھروندے بنانے میں اس حد تک مشغول تھا کہ مجھے اُس وقت ہوش آیا کہ جب میرے پاس کچھ خواتین نے آ کر دوپہر کے وقت چارپایوں پہ کھیس ڈال کر ایک باپردہ جگہ کا انتظام کرنا شروع کر دیا ابھی یہ پردہ ہوا ہی تھا کہ تین چار خواتین والدہ کی اُس چارپائی کو اُٹھا لائیں جس پر اُن کا جسدِ اطہر محوِ استراحت تھا یونہی جسدِ اطہر کو چارپائی سے اُٹھا کر ایک ایسے تختے پر لٹایا گیا جس پر عام طور پر مردوں کو نہلایا جاتا ہے تو میں نے اُن کی طرف دیکھا اور مجھے اُن کا چہرۂ انور پُر نور دکھائی دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد میں پھر گھروندے بنانے میں دوبارہ مشغول ہو گیا۔ جب یہ خواتین والدہ کو نہلا کر فارغ ہوئیں اور انہوں نے ان کے جسدِ اطہر کو کفن پہنا دیا تو ایک خاتون میری طرف متوجہ ہوئیں اور مجھے گھروندے بنانے میں مشغول دیکھ کر تعجب کا اظہار کرنے لگیں اور دوسری خاتون سے فرمایا کہ یہ گھروندے بنانے میں اس حد تک مشغول ہے کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ آج ہمیشہ کے لئے اپنی ماں سے بچھڑ اور بچھڑ گیا ہے۔ ایک دوسری خاتون نے کہا اس شہدے کو کیا معلوم اس کے ساتھ

کیا ہو گیا ہے جب کچھ بڑا ہو گا تو اسے ہوش آئے گا تو اسے پتہ چلے گا کہ زمانہ اس کے ساتھ کیا چال چل گیا ہے۔ بہر حال ایک دوسری خاتون نے جو میری والدہ کے چہرۂ انور کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی انہوں نے بڑی زور سے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ان گھروندوں سے اُٹھا کر حکماً کہا کہ بچے اپنی ماں کا آخری مرتبہ دیدار پھر تجھے کبھی اپنی ماں کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔ وہ تمام خواتین میرے ساتھ نہایت شفقت و رحمت کا طرزِ عمل اختیار کئے ہوئے تھیں شاید اُنہیں میرے مستقبل کی حالت پر رحم آرہا تھا اس لئے اُن میں سے ایک خاتون نے کہا کہ آج اسے وہی کچھ کرنے دو جو یہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے کیا خبر کہ اس کی ماں اسے آخری بار ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہے۔ خواتین کے ان کلمات میں مجھے بہت زیادہ متاثر کر دیا اور میں نہایت شدت کے ساتھ ٹکٹکی باندھ کر ماں کے چہرۂ انور کو دیکھنے لگا اور بے ساختہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میرے اوپر گریہ کی حالت طاری ہو گئی۔ جب مجھے اس شدت سے روتے ہوئے دیکھا گیا تو ایک معمر خاتون جس کی شکل و صورت میری ماں کی شکل و صورت سے کافی مشابہ تھی اُس نے نہ صرف میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا بلکہ مجھے پیار کرتے ہوئے یوں کہا کہ بیٹے جب تک میں زندہ رہوں گی تم بھی اسی گاؤں میں رہو گے تو میں کسی نہ کسی حد تک ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو جانے کا احساس نہ ہونے دوں گی۔ اسی خاتون نے مجھے نہ صرف دلاسہ دیا بلکہ اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا اور جونہی اُن کے بازوؤں میں پہنچا تو دوسری خواتین نے والدہ کو جس چارپائی پر لٹایا ہوا تھا اُسے وہ اس جگہ سے اُٹھا کر جھگی کی جانب چل پڑیں۔ میں اُس خاتون کے بازوؤں میں تھا اور وہ خاتون بھی جھگی کی طرف چلنا شروع ہو گئی مجھے یوں محسوس ہوا کہ جس طرح میری والدہ مولا کریم کے حضور پہنچ گئی ہے اور وہ مولا کریم سے میرے حفظ و امان میں سپرد کر دیئے جانے کا اظہار کرتے ہوئے وہ دعا فرما رہی ہیں کہ اے مولائے کریم میرے ان معصوم اور ناتواں بچوں کی حفاظت فرما اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے یوں نصیحت فرما رہی ہیں کہ اے میرے بیٹے حی قیوم مولا کی حفاظت پر یقین رکھنا میں تجھے اُس ذات کی حفاظت کے سپرد کرتی ہوں جس کے لئے موت نہیں اور وہ ابدی حیات کا مالک ہے۔ یعنی وہ ذات جو اپنے اوپر بھروسہ رکھنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتی اور جو مالائے کریم یتیموں بے کسوں اور بے بسوں کا واحد سہارا ہے اور میں دعا کرتی ہوں کہ تو انسانوں کے فانی سہاروں پر تکیہ کرنے کی بجائے اُس مولائے کریم کے سہارے پر ہمیشہ تکیہ رکھے جس کا سہارا نہ کبھی ٹوٹتا ہے اور نہ ہی اپنے محتاج بندوں کو بے سہارا ہونے کا احساس کرنے دیتا ہے۔ اے میرے بیٹے میں دعا کرتی ہوں کہ تو اپنے آباء و اجداد کے علوم و معارف کا وارث بنے اور وہ مولائے کریم تجھے اپنے پاک کلام کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔ میں نے محسوس کیا کہ گویا میری ماں اپنے مولا کے حضور بڑی انکساری سے ابھی دعا کرنے میں مشغول ہے آخر میں میں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے اُن کی زبان پر یہ کلمات جاری ہیں کہ اے بیٹے اللہ تیرا رکھوالا ہو اور ہو تیرا محافظ و نگہبان بنا رہے۔ اللہ تجھے اپنا کلام سیکھنے اور سکھانے کی توفیق عنایت کرے۔ وہ اپنے آخری پیارے رسول کی میراث کو پانے اور اس کی حفاظت کرنے کی آپ کو توفیق عنایت فرمائے۔ اللہ تعالیٰ تجھے آپ کی امت کی خدمت و نصرت کی توفیق عنایت فرمائے اور میں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے اس دعا کے اختتام پر آمین یارب العالمین کے کلمات کہتے ہوئے اپنی دعا کو ختم کر رہی ہوں۔

یہ سب کچھ کرتے کراتے ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا اور کچھ دیر میں اذانِ ظہر سنائی دینے لگی۔ ابھی جس اذان پر کچھ زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ہماری جھگی کی طرف آ رہے ہیں ان کے چہروں پر سوگواری کے جذبات و احساسات کا غلبہ صاف دکھائی دے رہا تھا میں نے دیکھا کہ ان کے پیچھے پیچھے میرے دادا جی آہستہ آہستہ اپنے صافے سے اپنا منہ چھپائے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سب لوگ دادا جی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ جب دادا جی تشریف لے آئے تو سب نے آپ کے سامنے تعزیت کا اظہار کیا۔ بعض لوگ آہستہ آہستہ روتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُن میں سے کچھ لوگ میری طرف آگے بڑھ کر میرے سر پر شفقت و رحمت سے اپنے ہاتھ پھیرنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں یہ آواز بلند ہوئی کہ اے استاد کریم یعنی دادا جی کیا ہمیں میّت کو جنازہ پڑھانے کے لئے اُٹھانے اور لے جانے کی اجازت ہے دادا جی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چاروں طرف سے کلمہ شہادت کلمہ شہادت کی آوازیں آنے لگیں اور چار افراد نے آگے بڑھ کر والدہ کی چارپائی کو اپنے کندھوں پر اُٹھالیا۔ وقفے وقفے سے کلمۂ شہادت کی صدا بلند ہوتی رہی اور چارپائی کو کندھا دینے والے بدلتے رہے۔ حتیٰ کہ ہم اُس جگہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگے کہ جہاں پر اُس کی نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم آگے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک بزرگ نے میرے قریب آکر مجھ سے یوں فرمایا کہ آؤ بیٹے میں تجھے اپنے بازوؤں میں اُٹھالوں تا کہ تم کہیں تھک نہ جاؤ۔ میرے جواب کا انتظار کیا بغیر انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں اُٹھالیا۔ لیکن میں نے آہستہ سے اُسے عرض کی کہ چچا جان میں اپنی والدہ کی چارپائی کے پیچھے خود اپنے پاؤں پر چلنا چاہتا ہوں تا کہ والدہ کو اس آخری لمحے یہ احساس نہ ہو کہ میں انسانوں کے بھروسے پر زندگی گذارنے کا آغاز کر چکا ہوں۔ میں پیدل اپنی والدہ کے پیچھے چل کر اُس جگہ پہنچنا چاہتا ہوں جہاں اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی جانی ہے۔ لہٰذا مجھے اپنے بازوؤں سے اترنے کی اجازت دے دیں۔ انہوں نے نہایت پیار کے ساتھ مجھے اپنے بازوؤں سے نیچے اتار دیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا۔ میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگا حتیٰ کہ وہ خالی میدان آگیا جہاں پر ٹھیک ایک سال پہلے اسی تاریخ یعنی ۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو میرے والدِ محترم کا جنازہ پڑھا گیا تھا۔ آج بھی وہی ۹ جنوری کی تاریخ تھی تاہم سال بدل چکا تھا وہ ۱۹۴۸ء تھا اور آج ۹ جنوری ۱۹۴۹ء ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ والد اور والدہ کی وفات نو جنوری کو ہوئی اگرچہ سال الگ الگ تھے۔ بعضوں نے مجھے بتایا کہ دن بھی بدھ کا تھا اور مہینہ بھی صفر کا اور تاریخ بھی ۹ جنوری کی طرح ۹ صفر ہی تھی۔ لیکن مجھے اس میں کوئی شک ہے عام طور پر انگریزی اور اسلامی مہینے بدلتے رہتے ہیں اس لئے ۹ جنوری اور ۹ صفر کا ہونا اور پھر دن کے بھی بدھ یا جمعرات کا ہونا اس کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہاں یہ بات یقینی ہے کہ تاریخ ۹ جنوری ۱۹۴۹ء ہی تھی بہر حال جنازہ کے لئے لوگوں نے صف بندی کر لی اور صف بندی ہو جانے کے بعد امام مسجد نے دادا جی سے نمازِ جنازہ پڑھنے کی اجازت مانگی جو ٹوٹے ہوئے الفاظ میں دادا جی نے مرحمت فرما دی۔ نمازِ جنازہ کے بعد پھر اجتماعی دعا کروائی گئی۔ دعا کے بعد چارپائی کو اُٹھا کر قبرستان کی طرف لے جایا گیا۔ عصر کی نماز کا وقت ہونے والا تھا اس لئے لوگوں نے جلد ہی اُن کے جسدِ اطہر کو لحد میں اتار دیا اور میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ لحد میں اتارے جانے کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ قبر پر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ اکثر حضرات کچھ الفاظ دہرا رہے تھے جن کا مجھے مفہوم یا مطلب کچھ معلوم نہ تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ یہ کلمات کہہ رہے تھے۔ مِنهَا خَلَقنٰكُم وَ فِيهَا نُعِيدُكُم وَ مِنهَا نُخرِجُكُم تَارَةً اُخرٰى۔ حتیٰ کہ قبر کی مٹی اس شکل میں نظر آنے لگی گویا کہ وہ اونٹ

کی کوہان ہے پھر قبر پر پانی چھڑکا گیا کیونکہ نمازِ عصر کا وقت ہو چکا تھا اس لئے نمازِ عصر پڑھنے کے لئے وہ قبرستان کی مسجد میں چلے گئے۔ وہاں نمازِ عصر کے بعد دوبارہ اجتماعی دعا کروائی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر کچھ لوگوں نے وہ چارپائی اُٹھالی جس پر والدہ کے جسدِ اطہر کو اُٹھا کر لائے تھے۔ پھر لوگ دادا جی کے ارد گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے اجتماعی تعزیت کا اظہار کر لینے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جانے کی اجازت طلب کی۔ دادا جان نے ہر ایک کو اجازت دے دی اور خود میرا ہاتھ پکڑ کر ذرا سے فاصلے پر موجود قبر پر آ گئے۔ یہ میرے والد کی قبر تھی جو ٹھیک آج ہی کے دن ایک سال قبل اس قبرستان میں وارد ہوئے تھے اور ٹھیک ایک سال کے بعد اُسی دن اُن کی زوجہ محترمہ بھی اللہ کے حضور حاضر ہونے کے لئے آ پہنچی تھی۔ دادا جی نے کچھ وہاں قرآنِ حکیم کی تلاوت کی اور اپنے بیٹے کے لئے کافی دیر تک دعائے مغفرت کرتے رہے۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ کافی زیادہ اندھیرا چھا گیا ہے تو قبرستان کے تمام باسیوں کے لئے دعا کرتے ہوئے قبرستان سے نکلے اور گاؤں کی طرف مراجعت فرما ہوئے۔ چونکہ کافی اندھیرا چھا گیا تھا اور راستے میں کوئی روشنی کا انتظام نہ تھا لہٰذا مجھ سے پوچھنے لگے اس اندھیرے سے ڈر تو نہیں لگ رہا میں نے کہا جب تک آپ میرے ساتھ ہیں میں کسی اندھیرے سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ بہر حال ہم آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے گھر کی طرف رواں دواں رہے۔ جب ہم ذرا گاؤں کے قریب ہوئے تو میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ گاؤں کے کنارے پر دادا جی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اُن میں سے بعض نے دادا جی سے کہا کہ رات کا کھانا آپ ہمارے ہاں کھائیں۔ لیکن دادا جی نے کہا کہ کسی ایک کے گھر سے کھانا اور دوسرے کے گھر سے نہ کھانا یہ اچھا نہیں لگتا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری اس خیر خواہی کو اپنے ہاں شرفِ قبولیت بخشے۔ آج رات تو ہم کچھ نہیں کھائیں گے کیونکہ بھوک بالکل اتر چکی ہے۔ البتہ کل دیکھیں گے کہ کھانے کو طبیعت کچھ چاہتی ہے یا نہیں۔ اتنے میں ایک بزرگ نے میری طرف اشارہ کیا اور کہا کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کچھ دودھ اپنے گھر سے بھیج دوں جو یہ بچہ رات کو بھی پی لے اور صبح بھی۔ اور چونکہ سردی کا موسم ہے اس لئے اجازت دیں کہ میں کچھ لکڑیاں جلا کر اپنے بھائی کے ہاتھ آپ کے گھر بھیج دوں تاکہ آپ رات انہیں جلالیں تاکہ اس شدید سردی کا کچھ نہ کچھ مداوا ہو سکے۔ دادا جی نے دودھ کی اجازت تو دے دی لیکن لکڑیوں کے بارے فرمایا کہ انہیں چیرنے اور پھر جلائے رکھنے کا اہتمام کرنا مشکل ہے۔ نماز کے بعد ہم اپنے اپنے بستروں میں رات گذار لیں گے۔ جب ہم مسجد پہنچے تو نمازِ عشا کی جماعت ہو چکی تھی۔ دادا جی نے تنہا نماز پڑھی لیکن مجھے بھی اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔ میں نے کہا مجھے تو وضو نہیں آپ نے فرمایا پانی چونکہ ٹھنڈا ہے اور سردی بھی بہت زیادہ ہے لہٰذا تم فلاں جگہ جا کر تیمم کر لو وہ میرے ساتھ اس جگہ تک گئے اور مجھے تیمم کروایا۔ جب میں تیمم کر چکا تو آپ نے مجھے ساتھ کھڑا کر کے نمازِ عشاء انفرادی طور پر ادا کی پھر کچھ دیر مسجد کے کونے میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں سے قرآن سنتے رہے۔ کیونکہ وہ نماز کے بعد اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ دادا جی کا معمول تھا کہ وہ نمازِ عشاء کے بعد کافی لوگوں کو قرآنِ حکیم پڑھایا کرتے تھے اور پچھلا قرآن سُنا کرتے تھے آج بھی انہوں نے اس کا ناغہ نہ ہونے دیا۔ جب ہم گھر پہنچے تو ایک معمر خاتون جو صبح مجھے پیار کرتی رہی تھی وہ میرے چھوٹے بھائی کو گود میں لے کر وہاں موجود تھی۔ اُس نے بہت سا دودھ روٹیاں اور سالن بھی ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ دودھ مجھے پلایا اور بقیہ دودھ ہمارے گھر ہی میں چھوڑ دیا۔ روٹیوں کے بارے میں ہم نے معذرت کی کہ ہم یہ نہیں کھائیں گے۔ تو اُس خاتون نے کہا کہ میں ساتھ لے جاتی ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ صبح یہ باسی روٹی کھائیں۔ میں صبح

انشاء اللہ تازہ روٹی اور سالن لے کر آؤں گی۔ اُس خاتون کے ساتھ اُن کی بڑی بیٹی بھی تھی۔ خاتون نے اپنی بیٹی سے کہا بیٹی تھوڑا سا انتظار کرو میں اس بچے کو اپنی گود میں بٹھا کر لوری دے کر اس کو یہاں سُلا دینا چاہتی ہوں۔ جب یہ سو جائے گا پھر گھر جائیں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں جلد ہی سو گیا تھا کیونکہ اگلے دن جب یہ خاتون کھانا لے کر آئیں تو انہوں نے مجھے بتایا کہ رات کو تجھے بڑی جلدی نیند آ گئی تھی۔ ساتھ انہوں نے دادا جی سے پوچھا کہ آپ کی روٹی ہانڈی کا کیا بنے گا کیونکہ آپ کی روٹی ہانڈی بنانے والی جا چکی ہے۔ اور مجھے توقع نہیں ہے کہ آپ خود روٹی ہانڈی کا انتظام کر سکیں گے۔ دادا جی نے فرمایا کہ ان بچوں کی خالہ اسی گاؤں میں رہائش پذیر ہے امید ہے کہ وہ ان کے لئے روٹی ہانڈی کا کوئی انتظام کر لے گی۔ اُس خاتون نے کہا استاد صاحب جب تک اُس کی طرف سے روٹی ہانڈی کا معقول اور پکا انتظام نہیں ہو جاتا آپ مجھے اجازت دیں میں صبح شام آپ کے لئے روٹی سالن کا انتظام کرتی رہوں۔ دادا جی نے یہ سن کر فرمایا کہ بہن اللہ تعالیٰ تجھے اُس نیک جذبے کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ان کی خالہ کی طرف سے روٹی ہانڈی کا کوئی معقول انتظام ہو ہی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ کسی نہ کسی کے ہاں سے کوئی نہ کوئی ضرور انتظام فرما دیں گے۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو کوئی بات نہیں میں زندگی کے اس مرحلے میں بھی اپنے ربِ کریم سے مایوس نہیں ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ رب کریم اس کا کوئی نہ کوئی انتظام فرما دیں گے۔ وہ خاتون جو دودھ اور روٹی سالن لائی تھی وہ چلی گئی لیکن یہ کہہ کے گئی کہ مولوی صاحب جب تک آپ کی روٹی کا انتظام نہ ہو سکے گا اُس وقت تک میں دودھ اور روٹی آپ کو پہنچاتی رہوں گی۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ میرے اس عمل کو اپنے ہاں شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ بہر حال وہ جاتی دفعہ دودھ روٹی اور سالن دے کر گھر چلی گئی اور ساتھ ہی فرمایا رات کے کھانے کے بارے میں کسی محلے والے کو نہ کہنا کیونکہ اہلِ محلہ سے دودھ اور روٹی نہ لینا جب میں یہ انتظام نہ کر سکوں تو پھر کسی اور انتظام کی طرف توجہ مبذول کرنا۔ میں حیران ہوں کہ یہ کیسا ماحول تھا کہ پنجاب کے دیہات میں ایسی اسلامی اخوت اور بھائی چارہ پایا جاتا تھا کہ مقامی آبادی ایک دوسرے کے لئے اس حد تک خیر خواہی کا عملی مظاہرہ کرتی تھی کہ جن کے ہاں کوئی میت ہو جاتی تھی انہیں اپنے فرد کو مر جانے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ تمام لوگ جو اُس گاؤں میں رہتے تھے وہ ایک دوسرے کا درد بانٹ لیتے تھے۔ مل کر کھانا اور ایک دوسرے کا دکھ درد باہم بانٹ لینا اس دیہاتی معاشرت کا لازمہ تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ جب گاؤں میں کوئی ایسا شخص مہمان ہوتا جس کی گاؤں میں کوئی رشتہ داری نہ ہوتی تو وہ مسجد میں آ جاتا۔ مسجد کے ساتھ ایک ہجرہ بنا ہوا تھا جس میں پانچ دس افراد کے لئے بستر ہر وقت تیار رہتے تھے اور ان نو واردوں کے کھانے پینے کے لئے امام مسجد اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھا کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اگر امام مسجد خود ایسا انتظام نہ کر سکتے تھے تو کسی بھی نمازی کو کہہ دیا کرتے تھے کہ مسجد میں اتنے مہمان ہیں جاؤ اپنے گھر سے ان کے لئے اتنا دودھ اور اتنی روٹیاں اور سالن لے آؤ۔ ہر شخص اس مہمان نوازی کو اپنا اسلامی فریضہ سمجھتا تھا اور ایسا کرنا اُس کے لئے شرف و اعزاز کی بات ہوا کرتا تھا۔

جب والدہ کی وفات کی خبر چھوٹے دادا جی کو پہنچی تو وہ کچھ خواتین کو اپنے ساتھ لے کر ہمارے ہاں تعزیت کے لئے تشریف لائے ان کے ساتھ ہماری پھوپھی شکر الٰہی بھی شامل تھی۔ چھوٹے دادا جی نے واپس جاتے وقت ہماری اس پھوپھی کو ہمارے ہاں چھوڑ دیا تا کہ ہمارے ہاں دال روٹی کا نظام چلتا رہے۔ لیکن ہماری اقتصادی حالت نہایت کمزور تھی کیونکہ ہمارے ہاں کوئی بھی فرد کمائی کرنے والا نہ تھا۔ دادا جان بوڑھے تھے بڑے تایا مسعود احمد

ذہنی طور پر کوئی کام کرنے کے اہل نہ تھے۔ چھوٹے چچا سعید احمد بے روزگار تھے انہوں نے محکمہ نہر میں پٹوار کا امتحان پاس کر رکھا تھا لیکن ابھی اُن کی تعیناتی نہ ہوئی تھی وہ پیدل ہی ہمارے گاؤں سے ضلع ساہیوال کے محکمہ روزگار کے دفتر ہر ہفتے جایا کرتے تھے تاکہ پتہ چلے اُن کی تعیناتی کا لیٹر آگیا ہے یا نہیں۔ اس کسمپرسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے مرحوم حاجی نور الٰہی مرحوم کے دل میں جذبۂ ترحم پیدا فرمایا انہوں نے ایک دن نمازِ فجر کے بعد دادا جی سے کہا کہ جب تک آپ کے اقتصادی حالات میں کوئی بہتری نہیں آجاتی اُس وقت تک میرا بیٹا غلام اللہ روزانہ نمازِ عشاء کے بعد روٹی سالن اور دودھ وغیرہ دینے کے لئے آیا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اور اُن کے پسماندگان کو اس کا اجرِ عظیم عطا کرے کہ ایک لمبی مدّت تک وہ اپنے اس وعدے کو وفا کرتے رہے۔ اس کے بعد جلد ہی چچا صاحب کو محکمہ انہار کی طرف سے تعیناتی کا لیٹر موصول ہو گیا۔ اُن کے سفر پر جانے کے لئے ہمارے پاس کوئی نقدی موجود نہ تھی لہٰذا تین چار من گندم جو گھر میں موجود تھی اُسے بیچ کر اُن کے لئے دس پندرہ روپے کا انتظام کیا گیا۔ وہ اپنے حلقے میں چلے گئے۔ اُن کی اُس وقت ماہنامہ تنخواہ ۵۲ روپے لگی۔ اُس میں سے ۳۵، ۴۰ روپے اُس وقت تک بھیجتے رہے تا آنکہ اپریل ۱۹۵۴ء میں اُن کی شادی نہ ہو گئی۔ اس پوری مدت کے دوران ہماری پھوپھی ہمارے ہی پاس رہی اور گھر داری کے تمام لوازمات وہ انجام دیتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا آخرت میں اجرِ عظیم عطا کرے۔ انہوں نے ہمارے لیے بے پناہ قربانی دی۔ کیونکہ اُن کے اپنے بچے سسرال میں موجود تھے۔ وہ اُن کی شفقت سے محروم رہے لیکن وہ ہمیں اپنی شفقت سے نوازتی رہی یہاں تک کہ اُن کے خاوند نے دوسری شادی بھی کر لی۔ اور اس صدمے کو بھی انہوں نے نہایت ہمت سے برداشت کیا لیکن ہم پر منفی اثرات مرتب نہ ہونے دیئے حتیٰ کہ آگے چل کر ایک دفعہ ہم نے پھر اُن کی خدمت کی ضرورت لاحق ہوئی تو وہ خود تشریف لے آئیں۔ ہماری اقتصادی حالت اس قابل نہ تھی کہ ہم اُن کے بچوں کو بھی اپنے ساتھ رکھ سکتے تو وہ بچے اپنے دادا جی کے پاس رہے اور انہوں نے ان بچوں کو والدہ کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ انہوں نے ماں اور باپ دونوں کی شفقت سے اپنے ان پوتے اور پوتی کو نوازا۔ زندگی کے یہ کٹھن ایام بہت آہستہ آہستہ گذرے اور اُن کی شدت کا ہمیں بہت تلخ تجربہ ہوا۔ ہماری اس پھوپھو کی آل اولاد میں سے ایک ہی اُن کی بیٹی صدیقہ طاہرہ حیات ہیں اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنی حفاظت میں رکھے لمبی عمر عطا ہو اور اُن کی آل اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ کامیابیاں اور سرفرازیاں عطا کرے۔ ہماری اس پھوپھو کے ہمارے اور ہماری آل اولاد پر یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ جس کا بدلہ دیا جانا ممکن نہیں۔ بہر حال اس تھوڑے ہی عرصے بعد ہمارے لئے اس مکان کو چھوڑنا ضروری ہو گیا۔ اس مکان کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اس مکان میں منتقل ہونے کے بعد میں باقاعدہ طور پر سکول میں داخل ہوا اور اس مکان میں ہم اُس وقت تک رہائش پذیر رہے تا آنکہ چچا جان نے اپنے حلقے میں ہمیں لے جانے کا فیصلہ نہ کر لیا۔ جب ہم اس حلقے میں منتقل ہوئے تو ہمارے ساتھ ہماری خالہ کی بیٹی ذکر الٰہی ہمارے ساتھ تھی۔ لیکن چونکہ وہ شادی شدہ تھیں اور اُن کا خاوند اس امر پر راضی نہ تھا کہ اُن کی بیوی ہمارے پاس رہے لہٰذا چند ہفتوں کے بعد اُن کا بھائی مرحوم فیض احمد ہمارے پاس آئے اور اگلے دن وہ اپنی بہن کو لے کر واپس چلے گئے۔ اس طرح پھر ہم خانہ داری کے حوالے سے ایک تکلیف دہ صورتِ حال میں مبتلا ہو گئے۔ برتن دھونا، جھاڑو دینا، گھر اور بستروں کو سلیقے سے رکھنا حتیٰ کہ سالن وغیرہ پکانا تو میں نے سیکھ لیا لیکن آٹا گھوندنا اور روٹی پکانا، نہ ہی میں نے اس طرف توجہ کی اور نہ ہی یہ فن مجھے آیا۔ اس دوران دادا جی پھر اپنے بھائی کے پاس ریاست بہاولپور گئے۔ اُنہیں اپنا دکھڑا

سنایا اُنہوں نے اپنی بہو کو ہمارے گھر امورِ خانہ داری چلانے کے لئے بھیج دیا لیکن غالباً یہ امر وہاں طے پا گیا تھا کہ ہمارے ہاں آنے والی خاتون جو ہماری ماموں زاد بہن تھی وہ اپنی خالہ کی بیٹی سے ہمارے چچا کی شادی کرا کر آئیں گی اور اس طرح ہمارا گھر آباد ہو جائے گا۔ بہر حال وہ ہمارے ہاں آئیں اور دو ماہ ہی میں شادی کے تمام انتظامات ہو گئے اور آخر کار ۱۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو ہمارے چچا کی شادی خانہ آبادی ہو گئی اور اس شادی کے بعد ہماری خانہ بدوشی کی حالت اختتام کو پہنچی اور خانہ داری کا عمل صحیح معنی میں شروع ہو گیا۔ چند ہی دنوں کے بعد ہماری چچی صاحبہ کی والدہ محترمہ بھی ہمارے ہاں تشریف لے آئیں کیونکہ ہو اپنے خاوند سے الگ ہو کر اکیلے زندگی گذار رہی تھیں اُن کے اور اُن کے خاوند کے درمیان ناچاکی چلی آ رہی تھی حتیٰ کہ اُن کے خاوند اپنی بیٹی کی شادی کی تقریب میں بھی شامل نہ ہوئے تھے۔ بعد میں ہمارے چچا نے اپنے سسر کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے جذبے سے اُنہیں راضی کیا اور اُن کا ہمارے ہاں آنا شروع ہو گیا لیکن اس پر ہمارے گھر پر مثبت اثر نہ پڑا بلکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ وہ اپنی بیٹی کو کئی کئی مہینوں کے لئے اپنے پاس لے جاتا۔ اُس دوران گھر میں وہی مسائل پیدا ہو جاتے جو خاتونِ خانہ نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح مجھے گھر کے معاملات چلانے پڑتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے تعلیمی حالات بہت پراگندہ ہو گئے۔ ایک طرف تو میں پہلی دوسری اور تیسری جماعت میں فسٹ آیا کرتا تھا یا اب یہ حالت ہو گئی کہ مجھے تیسری سے چوتھی جماعت میں رعایتی نمبروں سے پاس کیا گیا۔ اس چیز پر میرے اوپر بہت منفی اثر ہوا اور دادا جی نے بھی اس کو بہت شدت سے محسوس کیا۔ لیکن اس کا ہمارے پاس کوئی حل نہ تھا۔ میں پانچویں جماعت گیا تھا کہ ۱۹۵۵ء میں ہمارا گاؤں سیلاب کی زَد میں آ گیا۔ محترم چچا صاحب اپنی بیوی کو لینے کے لئے گئے ہوئے تھے جن کو وہاں پندرہ بیس دن لگ گئے اور پیچھے ہماری حالت بہت مخدوش ہو گئی۔ سیلاب کا پانی ہمارے قرب و جوار میں پہنچ گیا اور ہمارے ارد گرد کے گاؤں والے لوگ ہمارے گاؤں پہنچ گئے۔ ہماری حالت پہلے ہی پتلی تھی اب اُن کے بے یار و مددگار ہو کر ہمارے گاؤں آنے پر ہمارے اوپر اور منفی اثر پڑا۔ کافی دنوں کے بعد جب چچا اپنی بیوی کو لے کر گاؤں پہنچے تو پتہ چلا کہ اُن کا اس حلقے سے تبادلہ ہو چکا ہے اور اب ہمیں ضلع لاہور کی تحصیل قصور میں پتوکی کے قریب ایک گاؤں میں جانا ہو گا۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا جسے ایک ذیل کا مقام حاصل تھا۔ یہ قصبہ لوئر باری دوآب کے پل کے پاس واقع تھا۔ ہلا منہیس اس کا نام تھا اس کی آبادی کافی تھی لیکن سکول صرف پرائمری تھا۔ اور ایک ہی سکول ٹیچر تھے جو تمام کلاسوں کو پہلی سے پانچویں تک تمام مضامین پڑھاتے تھے اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور جلد ہی ہمارے سکول میں نئے ماسٹر جن کا نام محمد دین تھا وہ نہایت محنتی اور باصلاحیت استاد تھے اور اُن کے والد بھی محکمہ تعلیم میں ہی ایک دوسرے سکول میں نائب ہیڈ ماسٹر تھے انہوں نے ہمارے اوپر بہت محنت کی حتیٰ کہ چوتھی جماعت میں جو مضامین کمزور رہ گئے اُن کی بھی انہوں نے تلافی کی اور پانچویں جماعت کے مضامین بھی بہت محنت سے پڑھائے اور سمجھائے حتیٰ کہ انہوں نے مجھے پانچویں جماعت میں وظیفے کے امتحان کے لئے تیاری بھی کروائی۔ بہر حال میں پانچویں جماعت میں اس طرح پاس ہوا کہ ہمارے ہلّا سنٹر سے جتنے پرائمری سکول وابستہ تھے اور اُن میں جتنے بھی بچوں نے امتحان دیا تھا میرے نمبر اُن میں سب سے زیادہ آئے جس کی وجہ سے ہمارے قریب ہی دریائے راوی کے کنارے پر دلّو ملتانی قصبے میں جو مڈل سکول پایا جاتا تھا وہاں کے ہیڈ ماسٹر نے مجھے نہایت شوق کے ساتھ اپنے ہاں داخل کر لیا۔ ہم وہاں تقریباً ڈیڑھ سال تک رہے پھر ستمبر ۱۹۵۶ء میں چچا کے ساتھ گاؤں والوں کا کوئی تنازعہ کھڑا ہو گیا اور اس تنازعہ

کے نتیجہ میں ہمیں یہ گاؤں چھوڑنا پڑا۔ مجھے یہ یاد ہے کہ ایک دفعہ اس گاؤں میں میرے چچا صاحب اس حد تک بیمار ہوئے کہ اُن کی صحت یابی بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ میں انتہائی غم کی حالت میں دادا جی کے پاس مسجد میں گیا کیونکہ وہ اکثر اوقات مسجد ہی میں معتکف رہا کرتے تھے۔ میں نے انہیں رو کر بتایا کہ چچا کی حالت بہت خراب ہے۔ اُن کی بحالیٔ صحت کی خصوصی دعا فرمائیں۔ دادا جی نے اُس وقت جو کلمات ارشاد فرمائے وہ مجھے آج تک اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے اس بڑھاپے میں ہمارے اس بیٹے کے سوا اور اقتصادی سہارا نہیں رہا اور میں اس بڑھاپے کی حالت میں تجھے پالنے پوسنے اور تعلیم دلانے کے قابل نہیں رہا اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں لہٰذا مجھ یہ یقینِ کامل ہے کہ تمہارے چچا جو ہمارے لئے واحد اقتصادی سہارا ہیں اللہ تعالیٰ وہ ہم سے واپس نہیں لیں گے اور وہ جلد ہی صحت و سلامتی کی حالت میں لوٹ آئیں گے۔ میں نے دیکھا کہ دو ہی دن میں اُن کی حالت بہتر ہونا شروع ہو گئی اور ایک ہفتے کے بعد وہ نہایت عمدگی سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے قابل ہو گئے۔ بہر حال ہمیں اس تنازع کی وجہ سے یہ گاؤں چھوڑنا پڑا اور ہم 57/5 L- کے گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ یہ گاؤں ایک نہر کے اوپر آج بھی آباد چلا آ رہا ہے۔ نہر نے اس گاؤں کی فضا کو بہت پر سکوں بنا دیا ہے اور گاؤں والوں کی زمینوں کی آبپاشی اور جانوروں کو پانی پلانے کے لئے وافر سہولت بہم پہنچا دی ہے۔ گرمیوں کی راتوں میں ہم لوگ اکثر اس نہر میں نہا کر گرمی کو اپنے ہاں سے دور کیا کرتے تھے اور گرمیوں میں اس نہر پر پائے جانے والے بڑے بڑے اونچے کیکر کے درختوں کے سایے میں ہم اپنے جانوروں کے ساتھ دوپہر گزارا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات جب گرمی بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی تو ہم اس نہر میں خوب نہایا کرتے تھے۔ اس گاؤں میں کوئی سکول نہ تھا نہ مڈل نہ پرائمری۔ یہاں سے قریب ترین سکول تقریباً پانچ میل دُور تھا۔ میں وسطِ سال میں اس گاؤں میں منتقل ہوا جس کی وجہ سے میں اُس سکول میں داخل ہونے سے رہ گیا اور پھر چچا صاحب بھی چونکہ اپنے حلقے میں اپنی بیوی کو لے کر ہم سے الگ ہو گئے تھے لہٰذا اب پھر وہی مسئلہ پیدا ہوا کہ گھر خانہ داری کے نظام کو کیسے قائم رکھا جائے۔ اس آڑے وقت میں پھر ہماری پھوپھو ہماری مدد کو پہنچی اور اپنے بچوں کو دوبارہ اُن کے دادا کی تحویل میں دے کر ہمارے ہاں تشریف لے آئی۔ کیونکہ اُن کے آنے سے ہمارے ہاں تو خانہ داری کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اُن کے بچوں پر پھر دوبارہ منفی اثرات مرتب ہونے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد میں دُور کے ہائی سکول میں داخل ہوا لیکن میرا ایک سال ضائع ہو چکا تھا۔ اور میں دوبارہ ساتویں جماعت ہی میں داخل ہوا۔ یہ ہائی سکول کافی دُور تھا لہٰذا میں فجر کے بعد اس کے لئے نکلتا اور مغرب کے قریب واپس گھر لوٹتا ۔ سکول کے اساتذہ بہت قابل تھے اور سکول کے ہیڈ ماسٹر مرحوم مرزا شفیق بیگ غیر معمولی طور پر قابل، باصلاحیت اور بچوں کے لئے انتہائی مہربان استاد تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہمارا ریاضی کا استاد نہ آیا ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع ہوئی اور وہ تشریف لائے اور آتے ہی انہوں نے ریاضی کے سوالات لکھا کر ہمارا امتحان لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے پانچ سوالات دیئے اور آدھ گھنٹے میں انہیں حل کرنے کو کہا۔ میں نے پندرہ منٹ میں یہ تمام سوالات حل کر لئے اور اپنے ڈیسک پر کھڑے ہو کر ہیڈ ماسٹر کی طرف اشارہ کیا کہ میں نے سوالات سب کے سب حل کر لیے ہیں۔ اُنہیں یقین نہ آیا کہ ایسا ہو سکتا ہے انہوں نے فرمایا اور حل شدہ سوالات کو دوبارہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ جلدی میں تم انہیں غلط سلط حل کیا ہو۔ میں اُن کے حکم کی تعمیل میں بیٹھ گیا لیکن کاپی ڈیسک پر رکھ دی اور میں نے سوالات دیکھنے کی بجائے دینیات کی کتاب پڑھنا شروع کر دی۔ آدھ گھنٹہ گذرنے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب سب سے

پہلے میرے ہی پاس تشریف لائے اور کہا لاؤ سب سے پہلے تمہاری ہی کاپی دیکھ لیتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے میرے سوالات کو ایک کی بجائے دو دفعہ چیک کیا۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی بچا ان سوالات کو صرف پندرہ منٹ میں صحیح طور پر حل کر سکتا ہے۔ اُس کے بعد انہوں نے دوسرے بچوں کی کاپیوں کو چیک کیا۔ میرے سوا صرف تین اور بچوں کے صرف دو دو سوالات صحیح ہوئے اور ہماری کلاس میں بتیس بچے تھے۔ ماسٹر صاحب نے مجھے سب کے سامنے شاباش دی اور مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ پھر فرمایا کہ تم سکول کے بعد دفتر میں آ کر ملنا۔ اگلے دن انہوں نے ہمارے کلاس انچارج کو بہت ڈانٹ ڈپٹ کی اور کل جو انہوں نے امتحان لیا تھا اُس کے نتیجے کے بارے میں انہیں باخبر کیا اور انہیں وارننگ دی کہ اگلے دو تین ماہ میں اس کلاس کی کارکردگی بہتر نہ ہوئی تو اُن کی اس سال کی سالانہ ترقی روک لی جائے گی۔ بہر حال میں چھٹی کے وقت ہیڈ ماسٹر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے میرا خاندانی حدود اربعہ معلوم کیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور ہمارا چچا کے علاوہ کوئی اور اقتصادی ذریعہ نہیں ہے تو سب سے پہلے انہوں نے یہ فرمایا کہ تم نے اپنے اس خاندانی پس منظر کے بارے انہیں آج تک یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا۔ مزید براں انہوں نے فرمایا آج سے تمہاری ہر طرح کی فیس معاف ہے اور یہ کہ آئندہ تم اپنی روٹی گھر سے نہ لایا کرو اور دوپہر کا کھانا میرے ساتھ میرے گھر میں کھایا کرو۔ میں نے اُن کی اس شفقت کا بے پناہ شکریہ ادا کیا لیکن کھانے کی پیشکش کو قبول نہ کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے دادا جی اور بھائی، تایا اور پھوپھی جس معیارِ زیست کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں اُس میں اور میرے معیارِ زیست میں فرق پیدا پڑ جائے۔ اس واقعہ سے سکول میں میری کافی شہرت ہو گئی۔ مزید بر آں اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اگلے ہی دن ہمارے سکول میں یومِ والدین بڑے دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں نہ صرف شروع ہوئیں بلکہ یوم والدین کے انعقاد کا فیصلہ ہو گیا۔ دوپہر کے وقت سکول کے کھلے میدان میں یومِ والدین کا انعقاد ہوا اور اس صدارت کے لئے ہمارے علاقے کے انسپکٹر آف سکولز تشریف لے آئے۔ سکول کے بچوں کے علاوہ گرد اگرد دیہات کے معززین اور بچوں کے والدین بھی بڑی تعداد میں اس میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ بزمِ والدین کا آغاز ہوا اور مختلف جماعتیں اپنی اپنی باری پر اپنے ہاں سے ایک نمائندہ فرد کو آگے بھیجتی رہیں تا کہ وہ کسی منتخب موضوع پر تقریر کرنے کے لئے بھیجتی رہیں۔ جب ہماری جماعت کی باری آئی تو ہم میں سے جس کا انتخاب کیا گیا تھا وہ جب سٹیج پر پہنچے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں صفائی کے موضوع پر فی البدیع یا تیار شدہ تقریر کرنے کو کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے قائداعظم علیہ الرحمۃ پر تقریر تیار کی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہماری کلاس سے پوچھا کہ کیا کوئی ہم میں سے صفائی کے موضوع پر تقریر کر سکتا ہے۔ میں نے کھڑے ہو کر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ ہیڈ ماسٹر نے پہلے بچے کو واپس بھیج دیا اور مجھے سٹیج پر بُلا کر تقریر کرنے کو کہا۔ میں نے صفائی کے موضوع پر دس منٹ کی بجائے پندرہ منٹ کی تقریر کی اور آخر پر میں نے اسے اس شعر پر ختم کیا کہ

صفائی کو رکھو ہمیشہ عزیز

صفائی سے بڑھ کر نہیں کوئی چیز

جب اس بزم کا اختتام ہوا اور بچوں کو انعام دیئے جانے کی باری آئی تو مجھے تقریری مقابلے میں اوّل آنے کا پہلا انعام دیا گیا جو غالباً تیس پینتیس روپے تھا۔ مجھے لفافے کی صورت میں یہ انعام دیا گیا اور ساتھ ہی ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری ذہانت اور قابلیت اور تعلیمی لگن کے بارے میں بہت حوصلہ افزا الفاظ میں سب سامعین و ناظرین کے سامنے اس امر کا برملا اظہار فرمایا۔ ان معززین میں ایک بہت بڑی شخصیت نمبر دار ملک محمد عبداللہ خاں صاحب کی تھی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر ماسٹر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ بچا قاضی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس کے والد صاحب حافظِ قرآن تھے۔ اسی طرح اس کے دادا جی بھی حافظوں کے استاد ہیں۔ اور خطابت اس خاندان کا پیشہ ہے لہٰذا اگر یہ بچہ تقریری مقابلے میں فسٹ آیا ہے تو اس میں کچھ زیادہ تعجب کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم آپ نے جس طرح اس کی تعلیمی قابلیت اور لگن اور محنت کا ذکر کیا ہے میں اس پر اس بچے کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میں جب گھر پر یہ انعام لے کر آیا تو دادا جی بہت خوش ہوئے اور انہیں اس امر کی بھی خوشی تھی کہ باوجود اس کے کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر باہر سے ایندھن بھی اکٹھا کیا کرتا تھا اور سکول ٹائم کے بعد بھینس کے لئے گھاس کاٹنے کے لئے بھی ہم دونوں بھائی جایا کرتے تھے۔ اور مزید براں یہ کہ بعض اوقات جب گھاس نہیں ملتی تھی تو ہم دونوں بھائی دوسرے زمینداروں کے ہاں جا کر اُن کے کماد کو جو گڑھ بنانے کے لئے کاٹ کر رکھا گیا ہوتا تھا اُسے صاف کر کے اُس کے پچھلے حصے کو سبز پتوں پر مشتمل ہوتا تھا اُسے اپنی بھینس کے لئے چارے کے طور پر لایا کرتے تھے۔ اس محنت و مشقت کے باوجود میرا تعلیمی کیریر اور تعلیمی صلاحیت سب کے لئے تعجب کا باعث تھی۔ میں نے ساتویں جماعت بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کی اور پھر آٹھویں جماعت میں پہنچ گیا۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچا تو گرمیوں کی چھٹیوں میں میرے اندر یہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ میں مذہبی جلسوں میں حاضری دینے لگا اور اس کے لئے دُور دراز کے دیہات حتیٰ کے ساہیوال اور اوکاڑہ میں بھی پیدال جانے لگا۔ حتیٰ کہ انہی گرمیوں کی چھٹیوں میں میں اوکاڑہ کے قریب میں کرمانوالہ میں موجود سید اسماعیل بخاری عرف حضرت کرمانوالہ کی تقریر سننے اور اُن کی صحبت سے فائدہ اُٹھانے کیلئے ہر جمعے اُن کی خدمت میں حاضری دینے لگا۔ طبیعت میں بہت زیادہ بے چینی پیدا ہو چکی تھی اور اسے دُور کرنے کے لئے میں دیپالپور میں حضرت سائیں عبدالرزّاق کی خدمت میں بھی حاضری دینے لگا۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ تو میں پندرہ بیس دن تک اُن کی صحبت میں رہ پڑا لیکن بے چینی دور نہ ہوئی۔ پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں کرمانوالہ میں نمازِ جمعہ پڑھ کر واپس گھر آنے کے لئے پَر تول رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میری جیب خالی ہے واپس گھر پیدل جانا ہو گا حتیٰ کہ کھانا کھانے کے لئے بھی میرے پاس پیسے نہ تھے۔ لہٰذا میں نے گھر جانے کی بجائے رات اوکاڑہ کی کسی مسجد میں رات گذارنے کا فیصلہ کیا اور صبح کے وقت نمازِ فجر کے بعد گھر جانے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں رات گذارنے کے لئے چلتے چلاتے جامعہ محمدیہ کی بلڈنگ میں جا پہنچا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ اہلحدیث ہیں۔ میں جب وہاں پہنچا تو مغرب کی آذان ہو رہی تھی۔ میں بھوکا تھا کیونکہ صبح کا کھانا کھانے کے بعد میں نے ابھی تک کچھ نہ کھایا تھا۔ لہٰذا شدید بھوک کا احساس ہو رہا تھا لیکن میری جیب خالی تھی اس لئے کچھ نہ کھا سکا اور نہ ہی مسجد میں کسی سے کھانا کھانے کے لئے کہہ سکا۔ جب میں نمازِ مغرب سے فارغ ہو کر ایک کونے میں الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گیا تو اچانک اسی مسجد کے اندر میری عمر کے بچوں نے تپایاں لگانا شروع کر دیں اور کچھ کتابیں لے کر وہ اُن کے اوپر بیٹھ گئے۔ مجھ سے قریب ترین دس پندرہ طلباء

عربی زبان میں کوئی کتاب پڑھنے لگے۔ مجھے صرف اُن کے الفاظ سنائی دے رہے تھے۔ مفہوم و معنیٰ سے بالکل میں نابلد تھا۔ اُن بچوں میں ایک مجھے مانیٹر محسوس ہوا جس نے دوسرے بچوں کے سامنے یہ الفاظ دہرائے کہ السمک یعیش فی الماءِ۔ یہ الفاظ دہرا کر اُس نے اپنے ساتھیوں سے ایک ایک لفظ کا عربی حوالے سے معنیٰ پوچھا اور اُن بچوں نے ایک ایک لفظ کا الگ الگ معنیٰ بتایا پھر اس نے اُن سے پوچھا اگر ایک مچھلی کی بجائے بہت سی مچھلیاں ہوتیں تو اس مفہوم کو عربی کے کن الفاظ میں ادا کیا جاتا۔ اسی طرح کے عربی جملے اردو زبان میں ترجمہ کیے گئے اور اُردو زبان کے جملوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ ایک گھنٹے کا وقت میری زندگی کے پورے رُخ کو تبدیل کرنے کا ایسا سبب بنا کہ جس سے میری زندگی کا رُخ ہی تبدیل نہ ہوا بلکہ میری مستقبل کی زندگی بالکل ایک نئی ڈگر پر پڑ گئی۔ ہوا یوں کہ جب ان بچوں نے کتابیں بند کر لیں تو میں اُس مانیٹر کے پاس گیا اُس سے پوچھا کہ کیا عربی زبان کے ہر ہر لفظ کا کوئی معنیٰ ہوتا ہے۔ اُس نے کہا کیوں نہیں۔ پھر میں نے کہا جب ہم عربی میں قرآن کی یہ آیت پڑھتے ہیں اِذ قَالَ رَبُّکَ لِلمَلٰئِکَۃِ۔ کیا ان قرآنی الفاظ پر بھی کوئی الگ الگ معنیٰ ہے اُس نے کہا کیوں نہیں۔ اور میری اُس وقت یہ حالت تھی کہ میں پورا قرآن پڑھ چکا تھا اور کئی ایک صورتیں بھی مجھے ازبر تھیں لیکن میں جب بھی یہ قرآن پڑھتا تھا تو میرا یقین تھا کہ ان قرآنی الفاظ کا نہ تو کوئی مطلب ہے اور نہ ہی مفہوم و ترجمہ بلکہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے حصولِ برکت کے لئے نازل فرمائے ہیں اور ان کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم انہیں دہرائیں، ثواب حاصل کریں اور یہ ثواب اپنے وفات یافتہ عزیز و اقارب کو پہنچائیں اور بس۔ لیکن جب مجھے اس حقیقت سے آگاہی ہوئی کہ یہ قرآنی الفاظ با معنیٰ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مفہوم اور معنیٰ ہے تو اس انکشافِ حقیقت کے بعد میرا عجب حال تھا۔ کہ مجھے ایک طرف تو اپنی گذشتہ زندگی پر افسوس ہو رہا تھا کہ آج تک میں قرآنی الفاظ کے مفہوم و معانیٰ سے کیوں باخبر نہ ہو سکا مجھے احساس ہوا کہ میں نے اب تک کی اپنی ساری زندگی ضائع کر دی ہے۔ پھر جب میں اُس رات سونے کی کوشش کرتا تو مجھے گذری ہوئی زندگی کے ضائع ہونے کا اتنا افسوس ہوتا کہ وہ آئی ہوئی نیند کو مجھ سے دُور کر دیتا اور مجھے شدید احساس ہوا کہ میں انتہائی ناکام و نامراد زندگی گذار رہا ہوں۔ مزید براں اُس رات مجھے اپنی والدہ کی دعائیں اور بالخصوص وہ کلمات جو انہوں نے اپنی وفات سے چند لمحات پہلے کہے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے قرآن کے علوم و معارف کا عالم اور حامل بنائے۔ یہ الفاظ جونہی مجھے یاد آتے ایک طرف مجھے والدہ کی یاد ستانے لگتی اور دوسری طرف زندگی کے ضائع ہو جانے اور اپنی ناکامی و نامرادی کا احساس مجھے آگھیرتا۔ نتیجتاً میں اُس رات بالکل نہ سو سکا اور اسی ادھیڑ بُن میں اذانِ فجر کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں فجر سے پہلے اس امر کا فیصلہ کر چکا تھا کہ اب میں اپنی زندگی میں صرف اور صرف عربی زبان کی تعلیم حاصل کروں گا اتنی زیادہ حاصل کروں گا کہ میں عربی پڑھ سکوں لکھ سکوں اچھی طرح سمجھ سکوں اور دوسرے لوگوں کو قرآنِ حکیم سمجھا سکوں۔ اس فیصلے نے میرے اندر ایسی تبدیلی پیدا کی کہ اس کے نتیجے میں میری اب تک کی گذشتہ زندگی میری نظر میں ناکامی و نامرادی کی علامت بن گئی اور آئندہ کے لئے عزم بالجزم کر لیا کہ تمام زندگی صرف اور صرف عربی زبان کی تحصیل اور تعلیم کے لئے وقف ہو گی اور اس کا مقصد صرف ایک ہی ہو گا علوم و معارفِ قرآن کو سمجھا اور سیکھا جائے تاکہ والدہ کی نصیحت کو پورا کیا جا سکے اور اُن کی تمناؤں کو عملی شکل دے کر دنیاوی و اُخروی سعادت حاصل کی جا سکے۔ میں یہ فیصلہ کر کے اپنے گاؤں کی طرف دَوڑ پڑا اور اٹھارہ بیس میل کی مسافت میں نے تین گھنٹوں میں طے کر لی اور گھر پہنچتے ہی میں نے دادا جی سے

اپنے فیصلے کا اظہار کر دیا۔ پھر جو بھی مجھے ملا اور جو بھی مجھے جانتا تھا ہر ایک کو دیوانہ وار اپنے اس فیصلے سے آگاہ کرنے لگا۔ میرے ہر رشتہ دار نے یہ فیصلہ سُن کر انتہائی افسوس کا اظہار کیا اور ہر ایک نے یہی کہا کہ تم عنقریب مڈل پاس کر کے سکول ٹیچری یا پٹوار کا امتحان پاس کر لو اپنے چچا کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہو اور اپنے گھر کا خرچہ اُٹھانے کے قابل ہو سکتے ہو۔ لیکن عربی پڑھنا مشکل اور بڑا ہی مشکل کام ہے۔ میرے خاندان کے پڑھے لکھے لوگ جو زیادہ تر مختلف گاؤں میں امامت کا فریضہ انجام دیتے تھے جب انہوں نے سُنا کہ میں نے عربی زبان سیکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور انگریزی سکول سے بالکل علیحدہ ہونے کا ذہن بنا چکا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے عربی زبان کے نحو اور صرف کو پڑھنے کی بڑی کوشش کی بڑے رٹّے لگائے، گردانیں یاد کی ہیں لیکن ہمیں تو عربی نہیں آئی اور نہ ہی ہم اپنے طور پر قرآن کا ترجمہ کر سکنے کی صلاحیت و اہلیت اپنے اندر پیدا کر سکے ہیں۔ اب اسے کیا شوق چرایا ہے یہ سکول کی تعلیم کو چھوڑ کر بہت غلط فیصلہ کر چکا ہے۔ سکول کی پڑھائی میں یہ بہت اچھا تھا۔ سکول کے ماسٹر ہی نہیں ہیڈ ماسٹر صاحب بھی بہت خوش تھے ۔ یہ بچہ اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلا رہا ہے۔ پہلے یہ اپنے ماں باپ کو روتا ہے اب انگریزی تعلیم چھوڑ کر زندگی بھر اپنے مستقبل کو روتا رہے گا۔ اسے سمجھاؤ ورنہ یہ کہیں کا نہیں رہے گا۔ اس کا گھر تو پہلے ہی اپنی چھت سے محروم ہو چکا ہے دادا کمزور ہیں چھوٹا بھائی بہت چھوٹا ہے۔ اس کے تایا اللہ لوک ہیں اور چچا کب تک اپنے گھر کے ساتھ ساتھ ان کا بوجھ اُٹھائے رکھے گا۔ میری بڑی خالائیں اور جس کو بھی میرے اس فیصلے کا پتہ چلا وہ سب مجھے فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی سمجھا کر اس فیصلے سے باز رہنے کیلئے ہر وہ جتن کر گزرے جو اُن کے بس میں تھا لیکن میں تھا کہ میں ان باتوں میں سے کسی سے نہ متاثر ہوا اور نہ ہی میرے اس فیصلے میں کوئی ادنیٰ ترین تبدیلی پیدا ہوئی۔ آخر کار دادا جی نے یہ کہا اگر تم اس فیصلے پر تُل گئے ہو اور کسی قیمت پر باز آنے کے لیے تیار نہیں ہو تو میں تمہیں عربی کی تعلیم کے حصول کی اجازت دیتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ یہ تعلیم کہاں حاصل کرو گے کھانے پینے کا انتظام کیا ہو گا۔ شہر میں رہنے کے دیگر اخراجات کیسے پورے کرو گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے مجھے خوشدلی کے ساتھ روانہ کر دیں مجھے یہ احساس نہ ہو کہ آپ میرے فیصلے سے دلی طور پر ناراض ہیں کیونکہ میں آپ کی دلی ناراضگی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر میں آپ کو ناراض کر کے حصولِ علم کے لئے آگے بڑھوں گا تو میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ میری کامیابی کے لئے یہ بنیادی شرط ہے کہ آپ خوش دلی کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار فرمائیں۔ باقی رہی میری کامیابی یا ناکامی تو مجھے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ مجھے اس میدان میں ناکام نہ ہونے دے گا۔ اور یہ بھی میرا یقین ہے کہ میری والدہ نے جو میرے بارے میں دعائیں مانگی ہیں اور جن نیک تمناؤں کا میرے بارے میں اظہار کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ میں نے روتے ہوئے کہا کہ مجھے شدید افسوس ہے کہ میں نے اب تک دس بارہ سال کیوں ضائع کیے۔ اگر میں پہلے ہی کسی دینی مدرسے میں داخل ہو چکا ہوتا تو اب تک نہ صرف عربی زبان سیکھ چکا ہوتا بلکہ علوم و معارفِ قرآنیہ کی منزل کو بھی پا چکا ہوتا یا پانے والا ہوتا۔ دادا جی نے کہا کہ میں خوش دلی سے تمہیں اجازت دیتا ہوں اور میں اس حوالے سے تم سے کسی درجے بھی ناراض نہیں ہوں اور مجھے اب یہ نظر آنے لگا ہے کہ تم اپنے نانے کے راستے پر چل کر نانے کی طرح جلد ہی یہ منزل طے کر لو گے۔ پھر دادا جی مجھے باہر لے گئے اور فرمایا کہ بیٹے ہم آج اقتصادی طور پر تو نادار ہیں لیکن اخلاقی طور پر ہمارے خاندان کی جو روایت ہے اُس پر ہم ادنیٰ ترین داغ پر نہیں لگنے دیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ

ہماری خاندانی اخلاقی روایت کیا ہے کہ جس پر آپ نے ادنیٰ ترین داغ نہیں لگنے دیا اور مجھے بھی اس امر پر پختہ عزم کر لینا چاہئے کہ میرے ہاتھوں اُس خاندانی روایت کا نہ صرف بھرم قائم رہے بلکہ اُس کی صحت و صداقت میں میرے کردار سے اس میں اور اضافہ ہو۔ یہ سُن کر آپ نے پنجابی زبان میں یہ ارشاد فرمایا

چٹّی چادر ہے فقراں دی۔۔ اس نوں داغ نہ لائیں پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس راستے پر چلنے والوں کے لئے ہمارے خاندانی بزرگوں میں صدیوں سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ان سالکوں کو سیرتِ یوسفی کو ہمیشہ خضرِ راہ بنانا ہوتا ہے اور اس راستے میں اتنی ہی خدیجائیں راستے میں روپ سروپ کے ساتھ بن ٹھن کر پوری راعنائیوں سے حملہ آور کیوں نہ ہوں۔ سیرتِ یوسفی کی اس ڈھال کو کوئی ادنیٰ ترین داغ یا دھبہ نہ لگنا چاہئے۔ اگر تم میرے ساتھ عہد کرو کہ تم اسے پورا کرنے کے لئے ہر جتن سے کام لوگے تو میں تمہیں خوش دلی کے ساتھ اس راستے پر چلنے کی اجازت دیتا ہوں ۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور وسائل بھی ایسے نہیں کہ میں خود چل کر تمہیں کسی دینی مدرسے میں داخل کرا سکوں۔ لہٰذا میں تمہیں تمہارے اور اپنے خالق و مالک کے سپرد کرتا ہوں اور تمہارے لئے اب بھی دست بہ دعا ہوں اور آئندہ بھی عدم موجودگی میں دست بہ دعا رہوں گا کہ مسبب الاسباب تمہارے لیے اپنی رحمت سے سب چیزوں کا اہتمام اور انتظام فرمائے اور جہاں بھی جاؤ وہ اپنی رحمت سے تمہارے لئے بند دروازے کھولے اور تمہیں اپنے باپ نانا اور دیگر گذرے ہوئے آباء و اجداد کے علوم و معارف کا والی و وارث بنائے۔ اس کے بعد میں دادا جی کے ساتھ صلوٰۃ العصر کے لئے مسجد کی جانب چلا گیا عصر کی نماز پڑھ کر نہر پر چلا گیا نہر پر ایک جگہ جہاں کامل تنہائی تھی اور کوئی بھی فرد بشر دیکھ نہ سکتا تھا وہاں میں نہایا اور نہا کر نہر ہی کے کنارے دو نفل پڑھ کر دعا مانگنے لگا یہ دعا مانگتے مانگتے میں اس میں اتنا مستغرق ہو گیا کہ مجھے اپنے دائیں بائیں ماحول کی کچھ خبر نہ رہی مجھے اس عالمِ استغراق میں مجھے اپنی والدہ کا روشن چہرہ نظر آیا مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ میرے اس فیصلے کو سُن کر بہت خوش ہیں اور میرے لئے دعا کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے راستے کی مشکلات سے بچائے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے کسی صحیح مدرسہ میں داخل ہونے کی توفیق بخشے اور وہاں سے اساتذہ کے دلوں میں میرے لیے شفقت و رحمت پیدا فرمائے۔ اسی دوران مجھے اذانِ مغرب سنائی دی اور میں فوراً مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے مسجد کی طرف دوڑا۔ مغرب کی نماز ادا کر کے گھر آیا اپنی پھوپھی جن کا نام شکرِ الٰہی تھا انہیں میرے فیصلے سے آگاہی ہو چکی گی اُنہوں نے فرمایا کہ تو میرا بھتیجا نہیں بلکہ میں تجھے اپنا بیٹا مانتی ہوں۔ بلکہ اپنے بیٹے اور بیٹی سے زیادہ تجھے اپنا پیارا گردانتی ہوں اور اُن سے زیادہ تیرے لئے قربانیاں دی ہیں لہٰذا جو فیصلہ تم نے کیا ہے مجھے پتہ چلا ہے کہ ابا جان نے آپ کو خوشدلی سے اجازت دے دی ہے میں بھی تجھ سے راضی ہوں اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے علومِ قرآن کے حصول میں کامیابی عطا فرمائیں اور ہر طرح کی ناکامی و نامرادی تجھ سے دُور رکھے۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ تو اپنے ماموں غلام احمد کی طرح تجھے بہت جلد اس میں کامیابی عطا فرمائیں گے۔ میں اکثر تیری والدہ کی زبان سے یہ سُنا کرتی تھی کہ میرا یہ بیٹا اپنے ماموں کی طرح غیر معمولی ذہین بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے غیر معمولی حافظہ بھی عطا کیا ہے۔ اس کے وہ ماموں جوانی ہی میں جب کہ علومِ دینیہ حاصل کر کے واپس گھر لوٹنے والے تھے تو اچانک اُنہیں سرسام کے مرض نے گھیر لیا اور چند ہی دنوں میں اُن کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اور اُس کی اس بے وقت وفات نے میرے والد کی

ہوش و حواش پر بہت خطرناک حد تک حملہ کیا کہ اُس کے نتیجے میں وہ دوبارہ نماز پڑھانے کے قابل بھی نہ رہے۔ ہر وقت اپنے بیٹے کا نام لے کر روتے رہتے تھے اور عموماً مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اے میری بیٹی اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی بچہ عطا کرے تو اسے اپنے بھائی غلام احمد کا ثانی بنانے کی کوشش کرنا۔ پھوپھو نے بتایا کہ ہوا یوں کہ تیری ماں کو بہت حسین و جمیل بچہ عطا فرمایا جس کا نام طاہر احمد رکھا گیا اور پھر ڈیڑھ سال کے بعد اُن کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی جو بھائی کی طرح نہایت حسین و جمیل تھی اور اُس کا نام آمنہ رکھا گیا۔ یہ دونوں بھائی اتنے حسین و جمیل تھے کہ ہمارے قصبے کے بڑے بڑے خاندانوں کی خواتین ان بچوں کو دیکھنے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ اور جو بڑے پردے دار گھرانے تھے اُن کی خواتین گھر میں دیکھنے کے لئے آنے کی بجائے تیرے اس بھائی اور بہن کو اپنی خادماؤں کے ذریعے اپنے گھر بلایا کرتی تھیں۔ یہ ابھی دونوں بہن جوانی کو بھی نہ پہنچے تھے کہ شاید انہیں کسی خاتون کی نظر لگ گئی کہ یہ دونوں بہن بھائی بہت جلد وفات پا گئے اور ان کی وفات کا تیری دادی پر یہ اثر ہوا کہ وہ ان کو یاد کر کر کے اتنا روتیں کہ اُن کی صحت بگڑ گئی اور اِسی حالت میں عالمِ عقبیٰ کو سدھار گئی۔ تیرے والدین کے ہاں کئی سالوں تک اولاد نہ ہوئی کافی مدت کے بعد تیری پیدائش ہوئی اور والد صاحب نے تیرا نام مفتی کفایت اللہ دہلوی کے نام پر کفایت اللہ رکھا اور تیری ماں نے بارہا میرے اور میری جیسی دوسری رشتہ دار خواتین کے سامنے اس امر کا اظہار کیا کہ وہ اپنے اس بیٹے کو اللہ کی نذر کرتی ہیں اور دعا کرتی ہیں کہ یہ اپنے ماموں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قرآنی علوم و معارف کا عالم فاضل بنے اور اللہ تعالیٰ اسے لمبی عمر عطا کرے۔ تیری والدہ تجھے دوسری خواتین کی نظروں سے عام طور پر چھپا کر رکھتی تھیں اور یہ اس لئے کرتی تھیں کہ تجھے بھی کسی خاتون کی نظر نہ لگ جائے۔ یہ سب کچھ میں تجھے اس لئے بتا چکی ہوں تا کہ تجھے علم ہو کہ تو جس راستے پر چلنے کا فیصلہ کر چکا ہے یہ عین وہی راستہ ہے جس پر چلنے کی تیری والدہ نے تیرے ابتدائی ایام میں ہی دعائیں مانگی تھیں۔ لہٰذا اگر تو اپنی ماں کی تمناؤں کو پورا کرتے ہوئے اس راستے پر چلنے کا فیصلہ کر چکا ہے تو میں جو تیرے لئے اب ایک طرح سے ماں ہی کا حکم رکھتی ہوں تجھے خوش دلی کے ساتھ بغیر کسی نارضگی کے اس راستے پر آگے بڑھنے کی اجازت ہی نہیں دیتی بلکہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس منزل کو سر کرنے کی کامیابی و سرفرازیاں عطا فرمائے۔ اب گویا پورا گھر مجھے خوش دلی کے ساتھ اجازت دے چکا تھا اور ان کی اجازت کے بعد اب مجھے کسی اور کی اجازت کی چنداں فکر نہ تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کس شہر میں اور کس مدرسہ میں داخلے کی کوشش کی جائے۔ اوکاڑہ والا مدرسہ اہلحدیثوں کا تھا اور میں خاندانی طور پر اپنے آپ کو دیوبندی سمجھتا تھا لہٰذا کسی اہلحدیث مدرسہ میں جانا اور وہاں پڑھنا میرے اس موروثی فکر و احساس سے لگّا نہ کھاتا تھا۔ لہٰذا اگلے دن علی الصبح اوکاڑہ کی طرف چل پڑا۔ میں نے یہ سارا سفر پیدل طے کیا اور شاید جمعہ کا دن تھا میں فجر کے بعد چل کر بارہ بجے کے قریب اوکاڑہ پہنچا۔ میں اوکاڑہ کے گول چوک واقع جامعہ عثمانیہ کے دارالعلوم میں جا پہنچا۔ چلتے چلتے تھک چکا تھا مسجد کی وضو گاہ کا دروازہ کھُلا تھا اور وہاں ٹینکی کے وافر پانی کی وجہ سے کچھ ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے میں سو گیا اور جب میں بیدار ہوا تو اللہ تعالیٰ کا کرنا یہ ہوا کہ میرے چچا اسی جامعہ عثمانیہ میں اپنے گاؤں سے جمعہ پڑھنے کیلئے اس جگہ آموجود ہوئے۔ میں حیران رہ گیا۔ جان پہچان کے بعد علیک سلیک ہوئی پوچھا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو میرا تو خیال تھا کہ تم چھٹیوں میں سکول کا کام کرنے میں مصروف ہو گے کیونکہ اس دفعہ بہت زیادہ کام ملا تھا۔ اب چھٹیاں ختم ہونے کو ہیں اور سکول کھلنے والے ہیں تو تم یہاں کیسے آ گئے۔ میں نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اُن کا چہرہ میرا

یہ فیصلہ سُن کر فک ہو گیا گویا انہیں بہت بڑا ذہنی صدمہ پہنچا۔ انہوں نے اپنے اوپر قابو پا کر مجھ سے پوچھا کیا تم نے دادا جی سے اجازت لے لی ہے اور انہوں نے خوش دلی سے تجھے اس امر کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ یہ مرحلہ طے ہو چکا ہے۔ فرمانے لگے یہ کیسے میں نے ساری تفصیلات سے انہیں آگاہ کیا۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ نکالتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی شاید یہی مرضی ہے کہ میں تنہا دونوں خاندانوں کا بوجھ اُٹھاتا رہوں جب تک مجھ سے بن سکے گا میں اس بوجھ کو اُٹھانے میں پیچھے نہیں رہوں گا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے صحت و سلامتی عطا فرمائے اور پوری استقامت کے ساتھ اس بوجھ کو اُٹھانے کی توفیق کی ارزانی ہو۔ اس دوران وضو کر کے دونوں چچا اور بھتیجا نمازِ جمعہ پڑھنے کے لئے مسجد کے اندر چلے گئے۔ جمعہ کی نماز ختم ہوئی تو ہم نے ایک نوجوان سے اسی مدرسے کا طالب علم دکھائی دے رہا تھا اُس سے داخلے کا طریقہ کار پوچھا تو اس نے کہا کہ داخلہ مشکل ہے کیونکہ داخلے ماہِ شوال میں ہوتے ہیں اور اب ربیع الاول آچکا ہے داخلہ تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن تم دونوں مہتمم صاحب سے مل دیکھو شاید کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ چچا نے پوچھا مہتمم صاحب کہاں ہوتے ہیں۔ طالب علم نے کہا تم درخواست لکھ لو درخواست کے بعد میں تمہارے ساتھ مہتمم کے پاس چلا جاؤں گا۔ چچا نے جلد ہی ایک درخواست لکھی اور وہ طالب علم کو دکھائی۔ طالب علم ہمیں ساتھ لے کر مہتمم صاحب کے دفتر جا پہنچے۔ مہتمم صاحب نے درخواست کو پڑھا میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور کہا بیٹا تم نے اب تک کیا پڑھا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے سکول میں آٹھ جماعت تک پڑھا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ تم انگریزی سکول چھوڑ کر دینی مدرسے کی طرف کیوں آنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا یہ میری والدہ کی آخری تمنا تھی اور وصیت تھی۔ مجھے یہ وصیّت چند دن پہلے یاد آئی ہے اور چند دن پہلے ہی عربی زبان کی اہمیت کا احساس ہوا ہے اور یہ پتہ چلا ہے کہ علومِ قرآن کے کھلنے کے لئے عربی زبان کی حیثیت شاہ کلید کی ہے۔ میرے باپ دادا نانا سب ہی علماء تھے میں اُن کے ورثے کو حاصل کرنے کے لئے دن رات جدوجہد کرنے کا عزم کر چکا ہوں ۔ مہتمم صاحب میرے یہ الفاظ سُن کر اور میرا چہرا دیکھ کر فرمانے لگے بیٹا میں تجھے داخل تو کر لیتا ہوں لیکن کیونکہ تمہارا یہ چچا پٹواری نہر ہے لہٰذا اسے ہر ماہ تمہارے خرچے کی مد میں بیس روپے جمع کروانے ہوں گے۔ مہتمم صاحب نے چچا سے پوچھا اس رقم کی ادائیگی کے لئے تیار ہیں انہوں نے اپنی تنخواہ کی کمی اخراجات کی زیادتی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی عدمِ استطاعت کو بنیاد بنا کر کہا کہ یہ اُن کے لئے ممکن نہیں۔ مہتمم صاحب نے بھی اسی لمحے یہ کہہ دیا کہ ہمارے لیے بھی آپ کے اس بچے کو داخل کرنا ممکن نہیں۔

صفحہ نمبر ۲۵۳۲ ستمبر ۱۴ء تسلسل میں رکھیں

اُن کے اس جواب کے بعد ہم دوبارہ مسجد میں چلے آئے تاکہ آئندہ کے لائحہ ئ عمل کے بارے میں سوچا جائے چونکہ ہمیں علمائے دیوبند کے کسی اور مدرسے کا علم نہ تھا اور بریلوی یا اہلحدیث مدرسے میں داخلہ ہم نہیں چاہتے تھے اس لئے اس امر پر غور کرنا ضروری تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ چچا نے مجھے واپس جانے کو کہا میں نے کہا کہ اب واپس جانا میرے لئے ممکن نہیں میں یہیں رہوں گا اور مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی دن اس مدرسہ میں میرا داخلہ وہ جائے گا۔ چچا نے کہا کہ اچھا تم اپنے گھر کی بجائے آج رات میرے پاس گھر چلو کل پرسوں دوبارہ واپس آکر پیسوں کا کچھ بندوبست کرنے کی کوشش کریں گے۔ بادلِ نخواستہ میں اُن کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ ہم ریل بازار سے گذر کر اپنے گھر والے راستہ کی طرف آرہے تھے کہ چچا جان کے ایک

واقف پٹواری جن کا نام محمود علی تھا وہ ہمیں راستے میں مل گئے۔ چچا جان اور اُن کے مابین بہت دیر سے دوستی کا رشتہ قائم تھا۔ انہوں نے میرے بارے میں پوچھا چچا نے کہا کہ میرا بھتیجا ہے اور یہ علومِ دینیہ پڑھنا چاہتا ہے لیکن اس کا آج داخلہ نہیں ہو سکا اس لئے دو چار دن کے بعد دوبارہ یہاں آکر داخلے کی کوشش کریں گے۔ اُس نے کہا کہ اگر دیوبندی بریلوی کا جھگڑا نہ ہو تو میں اس کے لئے داخلے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ میں نے فوراً اس پر آمادگی ظاہر کر دی۔ یہ شخص میرے نانا اور ماموؤں کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ میرے ایک ماموں علامہ ضیاء الدین مرحوم محکمہ انہار میں ایک بڑے افسر تھے اور یہ شخص اُن کے ماتحت کام کر چکا تھا۔ یہ شخص جانتا تھا کہ میرے خاندان کا تعلق علماءِ دیوبند سے ہے۔ اس شخص نے چاہا کہ مجھے بریلوی مدرسہ میں داخل کروا کر مجھے علمائے دیوبند کی صف سے نکال لے۔ میں حکمتِ عملی کے تحت اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اگلی صبح اس نے مجھے ایک مولوی صاحب کے پاس بھیجا اور اُن سے کہا کہ یہ بچا ہمارے لیے نہایت عزیز اور محترم ہے اور اس کا داخلہ دار العلوم اشرف العلوم میں لازم ہے۔ اگر کوئی پیسے ویسے کا مسئلہ ہو تو ہم جو گراں قدر چندے کی رقم اس دار العلوم کو دیتے ہیں اُس میں سے اس کا حساب کتاب رکھ لیا جائے۔ چونکہ اس دار العلوم کے مہتمم ان کے ممنونِ احسان تھے لہٰذا داخلے میں کوئی مسئلہ نہ بنا۔ مسئلہ بس یہ تھا کہ یہ علماء و اساتذہ کٹڑ بریلوی تھے اور میرا ذہن بریلویوں سے بالکل مانوس نہ تھا۔ تاہم بامرِ مجبوری میں نے داخلہ لے لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ وہاں ایک عرب سیاح رہ رہا تھا جس سے پنجابی طلبہ بات چیت کرنے کے روادار نہ تھے۔ کیونکہ عرب سیاح کو اُردو پنجابی زبان سے کوئی شناسائی نہ تھی اور پنجابی طلباء عربی سے نابلد تھے۔ لیکن میں نے آتے ہی اس عرب سیاح سے دوستی اور خدمت کا رشتہ قائم کر لیا۔ اور میں نے دو تین ماہ میں اس باہمی رابطے سے اتنی شناسائی عربی زبان سے پیدا کر لی کہ وہاں دوسرے سال کے طلباء میری عربی شناسی پر حیران ہو گئے۔ تقریباً دو ماہ کے بعد میں ایک دن میں جمعہ پڑھنے دار العلوم عثمانیہ میں گیا۔ وہاں پر دار العلوم کے پرنسپل مرحوم علامہ عبد الحمید ٹونکی جو کہ بہت بڑے منتقی اور معقولی علماء میں شمار ہوتے تھے اور دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے اور شیخ الحدیث علامہ حسین احمد مدنی کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے پوچھا کہ تم نے یہاں داخلے کی درخواست دی تھی لیکن تم داخل کیوں نہیں ہوئے۔ میں نے کہا کہ جنابِ مہتمم صاحب نے مجھے یہاں داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ اب کہاں سے آئے ہو۔ میں نے کہا کہ میرے چچا جان نے مجھے ایک بریلوی مدرسے میں داخل کرا دیا ہے اور وہیں سے میں جمعہ پڑھنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ تم ذرا اپنا خاندانی تعارف کراؤ۔ میں نے کہا کہ میرے نانا اور چچے اور ماموں وغیرہ جامعہ امینیہ دہلی اور دار العلوم دیوبند کے فضلاء اور سند یافتہ علماء ہیں۔ اور ہماری علمائے بریلوی سے ہمیشہ بحث و تمحیص ہوتی رہتی ہے۔ اور میرے دادا کا تعلق جناب شیخ عبد القادر رائے پوری سے ہے۔ علامہ ٹونکی نے فرمایا اس سب کے باوجود تم بریلویوں کے مدرسے میں کیسے داخل ہو گئے۔ میں نے کہا یہ میری مجبوری تھی کیونکہ آپ بزرگوں نے مجھے اپنے ہاں داخل نہ کیا اور میں اگلے سال تک داخلے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ داخلہ میں نے نہیں بلکہ میرے چچا نے وہ بھی بامرِ مجبوری کروایا ہے۔ علامہ صاحب نے یہ سُن کر فوراً کہا کہ تم آج ہی یہاں آجاؤ تمہارا داخلہ میری ذمہ داری ہے میں تمہارے خاندانی پسِ منظر کو جان لینے کے بعد یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ہمارا کوئی بیٹا کسی بریلوی مدرسہ میں داخل ہو۔ میں نے عرض کیا ایسا نہ ہو کہ میں اُس مدرسے کو چھوڑ آؤں اور یہاں داخلہ نہ ہو۔ نتیجتاً نہ میں یہاں کا رہوں نہ وہاں

کا۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ یہ ناممکنات میں سے ہے۔ اگر میرے ہوتے ہوئے تمہارا یہاں داخلہ نہ ہو سکا تو میں اس مدرسہ کی صدارت چھوڑ دوں گا۔ لہٰذا تمہارا داخلہ پکا ہے۔ ابھی رات میرے ہی پاس قیام کرو اور صبح پہلے وقت ہی تمہارا داخلہ کروادوں گا۔ اس یقین دہانی کے بعد میں واپس پہنچا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں اس بریلوی ماحول سے کیسے نکلوں کیونکہ یہاں تمام اساتذہ کا میں منظورِ نظر بن چکا تھا اور طلباء مجھ سے شناسا ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ عرب سیاح مجھے اپنے سے ایک منٹ کے لئے بھی جدا ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اگلے دن عید میلاد النبی کا جلوس نکلنا تھا اور ہمارا مدرسہ عید میلاد النبی کی تیاریوں کے لئے مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ رات بھر جشنِ میلاد النبی کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ رات کے تین بج گئے۔ اب فیصلہ ہوا کہ کچھ دیر کے لئے سو لیا جائے کیونکہ نمازِ فجر کے بعد دوبارہ جلوس کی مصرفیات دن بھر جاری رہیں گی۔ جب اساتذہ طلباء اور عرب سیاح سب نیند کی آغوش میں چلے گئے اور مدرسے پر نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ سب مدہوشی کے عالم میں نیند کے ہاتھوں مجبور ہو کر سوئے ہوئے تھے میں اُٹھا سر پر اپنا بستر اا ور چھوٹی سی صندوقچی جس میں کچھ معمولی سا سامان تھا وہ سر پر اُٹھائے غیر مانوس راستوں سے رات کی تاریکی میں جامعہ دار العلوم عثمانیہ کی طرف چل پڑا۔ میں نے غیر مانوس راستہ اختیار کیا عام طور پر اس تنگ و تاریک گلی میں ٹریفک کا بہت کم رواج تھا اور میں نے دو میل کا راستہ جو اب چار پانچ کلو میٹر پر پھیل چکا تھا اسے تقریباً دو گھنٹوں میں طے کیا۔ اور جب میں دار العلوم عثمانیہ پہنچا تو اذانِ فجر ہو رہی تھی۔ اب میں نے سُکھ کا سانس لیا اور مجھے اطمینان تھا کہ کسی قیمت پر مجھے بریلوی علماء اپنے ہاں واپس نہیں لے جاسکتے۔ نمازِ فجر سے پہلے جنابِ پرنسپل صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے اپنے سامنے پا کر بہت خوش ہوئے اور نمازِ فجر کے فوراً بعد مہتمم صاحب سے ملاقات کی اور میرا خاندانی پس منظر بتا کر اُن سے انہوں نے کافی ناراضگی کا اظہار کیا کہ اُن کے داخلہ نہ دینے کی وجہ سے ہمارا ایک قیمتی بچہ بریلویوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ انہوں نے بھی معذرت کا اظہار فرمایا اور کہا کہ میں اس خاندانی پس منظر سے بالکل ناواقف تھا۔ اگر واقف ہوتا تو یہ امر بالکل وقوع پذیر نہ ہوتا۔ اُنہوں نے فوراً داخلے پر آمادگی ظاہر کر دی اور مجھے بُلا کر مجھ سے معذرت بھی کی اور ساتھ ہی فرمایا صبح سات بجے میرے پاس درخواست لکھ کر لے آنا میں اسی وقت داخلے کی منظوری دے دوں گا۔ تھوڑی دیر میں یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ پرنسپل صاحب نے فرمایا میں ابھی اپنے گھر سے تمہارے لیے ناشتہ بھیجتا ہوں اور میرے گھر سے کوئی بچہ چارپائی لا دے گا اور اگر کوئی کمرہ فارغ نہ ہوا تو تم میری ہی بیٹھک میں ڈھیرا لگا لینا ورنہ ایک دو دن میں کسی نہ کسی کمرے کا انتظام ضرور ہو جائے گا۔ میں ناشتہ کر لینے کے بعد ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک نوجوان حافظ عبد السبحان میرے پاس آئے اور کہا جنابِ پرنسپل صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں میں اُن کے پاس پہنچا وہ میرے داخلے کے لئے درخواست لکھ چکے تھے اور میری جگہ انہوں نے اپنے دستخط کر دیئے اور عبد السبحان سے کہا کہ درخواست اور کفایت اللہ کو ساتھ لے کر مہتمم صاحب کے پاس جاؤ اور دستخط کروا کر جلد واپس آ جاؤ۔ جونہی ہم جناب مہتمم صاحب کے پاس پہنچے انہوں نے دوبارہ مجھ سے معذرت کی اور اُسی لمحے اُنہوں نے میری درخواست پر دستخط کر دیئے۔ فوراً ہم پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے اُنہوں نے پہلے ہی میرے کوائف اُس استاد صاحب کو پہنچا دیئے تھے جن کے پاس داخلہ رجسٹر تھا۔ میرے آنے سے پہلے داخلہ رجسٹر میں میرا نام اور کوائف درج ہو چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی لانگری کو بلایا گیا اور لنگر خانے کے طلباء میں میرا اندراج کر دیا گیا۔ جنابِ پرنسپل صاحب نے لانگری محمد بشیر سے کہا کہ یہ ہمارا خاص بچہ ہے

کھانے پینے کے معاملات میں اس کی جانب سے تمہارے طرزِ عمل کے بارے میں کوئی شکایت مجھے نہیں پہنچنی چاہئے۔ ورنہ سخت جواب دہی ہو گی۔ لنگر خانے کا دستور یہ تھا کہ یہاں دو ٹائم بچوں کو کھانا ملتا تھا۔ ایک نمازِ فجر کے بعد اور دوسرا نمازِ عصر کے بعد۔ ہر بچے کو دو روٹیاں اور کوئی ایک سالن ملا کرتا تھا۔ سالن تین چار دن سبزی، ایک دو دن دال اور ایک دو دن گوشت ہوا کرتا تھا۔ کھانے کا معیار کافی بہتر تھا۔ کپڑے دھونے کے لئے مہینے میں ایک دفعہ صابن بھی ملتا تھا۔ اور جیب خرچ کیلئے مہینے میں چھوٹے درجے کے طالب علموں کے لئے دس روپے اور بڑے درجے کے طلباء کے لئے پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ جس دن لنگر خانے میں کسی وجہ سے روٹی سالن ملنے کا انتظام نہیں ہوتا تھا تو ایک کھانے کے عوض چھ آنے ملتے تھے۔ جس میں سے چار آنے کے ساتھ وافر مقدار میں روٹی سالن کا انتظام ہو جاتا تھا اور دو آنے بچ جاتے تھے۔ ہماری یہ خواہش ہوتی تھی کہ یہ ناغے بکثرت ہوں تا کہ ہمیں ان کی جگہ پر نقد پیسے ملیں اُن میں سے کھانے پر بھی خرچ ہو جائیں اور کچھ مزید بچت ہو جائے تا کہ اس بچت سے کوئی کتابیں خریدی جا سکیں۔

جب صبح کے کھانے کے بعد میں فارغ ہوا تو جنابِ پرنسپل صاحب نے مجھے اپنے خاص کمرہ میں بلایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں اب تک کیا پڑھتا رہا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے کچھ مدرسہ میں فارسی زبان سیکھنے کی ابتدائی کتابیں کیسے کریمہ، نامِ حق اور پندنامہ شروع کی تھیں لیکن زیادہ تر میں عرب سیاح کے ساتھ رہا ہوں اور میں نے اُس سے عربی زبان سیکھنے اور بولنے کی پریکٹس کی ہے۔ انہوں نے میرا عربی زبان میں امتحان لیا اور یہ سب کچھ جاننے کے بعد حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں یہ نہیں مان سکتا کہ تو نے دو ماہ کی قلیل مدت میں عربی زبان کی اتنی زیادہ واقفیت حاصل کر لی ہے۔ بہر حال وہ بہت خوش ہوئے انہوں نے فارسی زبان کے استاد مرحوم حافظ محمد اسماعیل صاحب کو اپنے ہاں بُلایا اور فرمایا یہ ہمارا خاص بچہ ہے اسے اپنے بچے کی طرح توجہ دیں اور جلد از جلد اتنی فارسی زبان پڑھا دیں کہ فارسی زبان میں لکھی گئی صرف و نحو کی کتابیں پڑھنے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئے۔ فوراً ہی کتب خانے کے انچارج کو بُلایا اور اُسے کہا کہ اس بچے کو میری ضمانت پر کریمہ، نامِ حق اور پندنامہ کی کتابیں جاری کر دی جائیں۔ کچھ ہی وقفے کے بعد یہ کتابیں مجھے مل گئیں اور میں یہ لے کر جنابِ حافظ اسماعیل صاحب کی خدمت میں جانے لگا تھا کہ مجھے روک دیا گیا۔ فرمایا رُکو ابھی تو عربی زبان کے اسباق کا انتظام نہیں ہو سکا۔ وہ انتظام بھی ہو جانے دو اور پھر فارسی زبان کی درس گاہ میں جانا۔ اسی دوران انہوں نے جنابِ استاد محمد منظور کو اپنے ہاں بُلایا اور اُن سے میرا تعارف کرواتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ بچہ میرا خاص بچہ ہے اسے میں عربی زبان کی تدریس کے لئے آپ کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ فی الحال آپ اسے عربی کا معلم حصہ اول شروع کروا دیں۔ اور اس کے ساتھ کوئی اور سبق شامل نہ کریں کیونکہ فارسی زبان کے تین چار اسباق اسے دن بھر میں لینے ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں مجھے کتب خانے کے انچارج نے معلمِ عربی کا پہلا حصہ پہنچا دیا۔ پرنسپل صاحب نے عربی زبان کے استاد سے یہ بھی فرمایا کہ اس بچے کا بیان ہے کہ اس نے کسی عرب سیاح سے صرف دو ماہ میں عربی زبان سیکھی ہے۔ لیکن اس کی عربی زبان کی استعداد اتنی اچھی ہے کہ ہمارے ہاں کا دو سال کا عربی زبان کا طالبعلم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بہر حال عربی کے حوالے سے یہ آپ کی تحویل میں ہو گا اور ہر پندرہ دن میں اس کی پراگریس رپورٹ دیتے رہنا۔ اس کے بعد جنابِ پرنسپل صاحب نے مجھے فارسی زبان کی درسگاہ کی طرف جانے کی اجازت دیدی۔ اور مجھے پتہ چل گیا کہ ظہر سے پہلے تک فارسی زبان پڑھنا ہو گی اور ظہر سے عصر تک عربی زبان کی تدریس ہوا کرے گی۔ فارسی زبان کے استاد نے خصوصی

شفقت کے ساتھ پڑھایا اور پہلے چھ ماہ میں میں کریمہ، نامِ حق اور پند نامہ پڑھ کر شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی کتاب گلستان تک پہنچ گیا اور اُدھر دو ہی ماہ میں میں نے معلّم کا حصہ اول بمع اُس کی تمرینات کے ختم کر دیا۔ جنابِ پرنسپل صاحب اس پراگریس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اُنہوں مجھے اور زیادہ خصوصی شفقت سے نوازنا شروع کر دیا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں نمازِ فجر سے بہت پہلے نیچے مسجد میں آ کر نمازِ تہجد پڑھ رہا تھا کہ مسجد کے بیرونی دروازے پر مسلسل دستک دیئے جانے کی آواز سُنائی دی۔ جس شخص کے پاس چابی تھی وہ سویا ہوا تھا۔ جو غالباً نیند کے غلبے کی وجہ سے دروازہ کھولنے کے لئے نیچے نہ آ سکا۔ میں دروازے پر پہنچا دیکھا کہ مہتمم صاحب دروازہ کھولنے کا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ دروازے کے تالے کی چابی کس کے پاس ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو میں نے کہا کہ میں ایک نووارد طالب علم ہوں۔ فرمایا تمہارا کیا نام ہے۔ میں نے کہا کفایت اللہ۔ انہوں نے کہا وہی جو چند دن پہلے داخل ہوا۔ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا تم اتنی جلدی کیوں اُٹھے ہوئے ہو۔ میں نے کہا کہ میں تہجد کے لئے روزانہ اُٹھا کرتا ہوں۔ اُنہوں نے پوچھا تم کب سے تہجد پڑھ رہے ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ تو مجھے بھی یاد نہیں۔ میں نے کہا کہ جب سے میں نماز شروع کی ہے اُس وقت سے میری تہجد قضا نہیں ہوئی۔ وہ حیران ہوئے اور فرمایا جاؤ اوپر طالبعلم چراغ خاں کے پاس چابی ہے اُسے کہو کہ وہ جلدی آ کر دروازہ کھولے۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ چراغ خاں کون ہے اور وہ کس کمرے میں رہتا ہے۔ اور اندر پوری مسجد کے حال پر شدید تاریکی کا غلبہ ہے۔ فرمایا کہ وہ کمرہ نمبرے میں رہتا ہے اس کمرے میں اس کی چارپائی کا نمبر ۲ ہے اور تم جہاں کھڑے ہو دائیں ہاتھ پر پوڑیاں ہیں اور اُن کے اندر ہی بلب لگا ہوا ہے۔ ذرا دائیں بائیں ٹٹول کر بٹن دبا دو روشنی ہو جائے گی۔ اور جب اوپر کی منزل پر جاؤ گے تو دائیں ہاتھ پر پھر بٹن ہے اُسے دباؤ پورے ہال میں روشنی ہو جائے گی۔ اُس میں کمروں پر نمبر لگے ہوئے ہیں۔ پھر کمرہ نمبرے میں جا کر اسی طرح بٹن دبا دو روشنی ہو جائے گی۔ اور بلند آواز سے چراغ خاں کا نام لو اور اسے کہو کہ نیچے مہتمم صاحب دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں جنابِ مہتمم سے اجازت لے کر اوپر گیا اور اُن کی ہدایات کے مطابق روشنی کرتے کراتے کمرہ نمبرے میں جا کر چراغ خاں کو جگایا۔ جب چراغ خاں کو پتہ چلا کہ جناب مہتمم صاحب کافی دیر سے باہر گلی میں دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں تو وہ حواس باختہ ہو کر اُٹھا اور اسی حواس باختگی کے عالم میں پوڑیوں سے تیزی کے ساتھ نیچے اُترنے لگا۔ اس طرح اُس کا پاؤں پھسلا خدا کا شکر ہے کہ کوئی شدید چوٹ نہ لگی اس پر اُس نے چابی میری طرف پھینکتے ہوئے مجھ التجا کی کہ میں جا کر دروازہ کھول دوں۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ مہتمم صاحب نے فرمایا چراغ خاں کدھر ہے۔ میں نے اُنہیں حادثے کی خبر دی فرمایا یہ مولوی لوگ بڑی جلدی حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ خوف بڑی جلدی ان پر قبضہ کر لیتا ہے۔ خیر نمازِ فجر کے بعد اس سے بات کریں گے۔ دروازہ کھلنے کے بعد مہتمم صاحب نے مجھے بہت پیار کیا۔ شفقت سے میرے سر پر کافی دیر تک ہاتھ پھیرتے رہے پوچھا تمہارے ماں باپ کیا کرتے ہیں۔ جب انہیں پتہ چلا کہ وہ دونوں وفات پا چکے ہیں تو فرمایا اچھا تم یتیم ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ تمہاری کفالت کون کرتا ہے۔ میں نے کہا وہی چچا جو پچھلی مرتبہ آپ کے پاس مجھے لے کر آئے تھے۔ فرمایا کہ وہ عیال دار ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں عیال داری تو ہے اگرچہ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اور یہ کہ اُن پر میرے دادا میرے چھوٹے بھائی اور میرے تایا کے خرچ کی فراہمی بھی انہی کے کندھوں پر ہے۔ مہتمم صاحب نے فرمایا کہ آئندہ ہم تمہارے وظیفے میں اضافہ کریں گے اور سال میں دو مرتبہ سرما اور گرما کے لئے دو دو جوڑے کپڑوں کے بھی

دیا کریں گے۔ اور جب کبھی تم نے گھر جانا ہو گا مجھے بتایا کرو گے اس آنے جانے کا کرایہ بھی میں تجھے دیا کروں گا۔ یاد رہے کہ یہ وظیفہ کپڑے اور آنے جانے کا خرچہ مدرسے کی مد سے نہیں ہو گا بلکہ یہ میں اپنی جیبِ خاص سے دیا کروں گا۔ میری تین چار بیٹیاں تو ہیں لیکن بیٹا کوئی نہیں۔ ایک بیٹا تھا جو تمہاری عمر کو پہنچ کر فوت ہو گیا تھا۔ تمہاری شکل صورت میں مجھے اپنا وہ بیٹا یاد آتا ہے لہٰذا آج سے تم ایک طالب علم ہی نہیں میرے بیٹے بھی ہو۔ جب تک تم اس مدرسہ میں رہو گے میری طرف سے تمہیں بیٹوں والی شفقت و رحمت ملتی رہے گی۔ ہمارے ہاں نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن ہوا کرتا تھا۔ جو پرنسپل صاحب ہی دیا کرتے تھے۔ میں نمازِ فجر کے بعد فارغ ہو کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ جنابِ پرنسپل صاحب نے مجھے روک لیا اور فرمایا کفایت اللہ تم میرے درسِ قرآن میں کیوں نہیں بیٹھتے۔ میں نے جواب دیا کہ سمجھتا تھا کہ یہ درسِ قرآن خاص بڑے لوگوں کے لیے ہوا کرتا ہے اور مجھ جیسا نوخیز طالبعلم شاید اس طرح کے درس میں بیٹھنے کا مجاز نہیں۔ فرمایا نہیں یہ درس طلباء ہی کے لئے ہے اگرچہ اُن کے لیے اس میں شرکت ضروری نہیں ہے کیونکہ اس طرح اُن کے اسباق میں حرج ہوتا ہے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ تم اگر اس درس میں شامل ہو گے تو تمہیں فائدہ تو بہت ہو گا اور حرج بالکل نہیں ہو گا۔ میں اسی وقت درس میں شامل ہو گیا۔ یہ سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کا درس تھا۔ شیخ الہند محمود الحسن کا ترجمہ ئ قرآن پرنسپل صاحب کے سامنے تھا اور شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی کے حواشی اُس کے اوپر ثبت تھے زیادہ تر جنابِ پرنسپل صاحب اسی ترجمے اور حواشی کو بڑے منطقی انداز میں فلسفیانہ انداز اور لکھنوی اسلوب میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ میں تو ان کے اس اسلوبِ بیان کا فریفتہ ہو گیا۔ اور پورے شوق سے اس درس کو سُننے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے حافظہ ایسا عطا فرمایا تھا کہ جو چیز ایک دفعہ پڑھ سُن یا دیکھ لیتا تھا وہ حافظے میں نقش ہو جاتی تھی پھر اُس کا بھولنا یا اُتارنا یا کھرچنا ناممکن ہوتا تھا۔ دو تین دن کے بعد جنابِ پرنسپل صاحب نے ایک دن ظہر کے بعد مجھے بُلایا اُس وقت اُن کی چھٹے سال کے طلباء کو ترجمۂ قرآن کی کلاس ہوا کرتی تھی۔ ایک بڑے طالب علم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس بچے کو دیکھو یہ تین چار دن سے میرے درسِ قرآن میں شریک ہو رہا ہے۔ جب یہ درس میں ہوتا ہے تو مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے اور ہمہ تن گوش ہو کر میرا ایک ایک لفظ سنتا ہے۔ جب کہ بڑے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت بھی کر لیتے ہیں۔ میں نے کبھی اس بچے کو کبھی اُن بڑوں کی بات چیت کی طرف متوجہ ہوتے نہیں دیکھا۔ آج میں نے اسے تمہارے پاس اس لئے بُلایا ہے کہ میں اسے تمہارے ساتھ ترجمہ ئ قرآن کی اس کلاس میں شامل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ معلمِ عربی کا حصہ اول بمع تمرینات کے ختم کر لیا ہے اور ابھی دوسرا حصہ شروع ہونے میں ایک مہینہ باقی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ایک مہینہ ترجمۂ قرآن کی کلاس میں شرکت کرے۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ انہوں نے کہا استاد صاحب ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ نے ترجمہ قرآن پڑھانا ہے ہم نے سُننا ہے تو اگر ہمارے ساتھ یہ بھی سُن لے تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ کریں۔ پرنسپل صاحب نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا کہ کفایت اللہ بتاؤ آج ہم نے ترجمۂ قرآن کے دَوران کیا کیا باتیں بتائی ہیں۔ میں سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۶ اور ۷ کے بارے میں جو کچھ استاد صاحب نے کہا تھا اور جو تقریر فرمائی تھی وہ میں نے ساری کی ساری من و عن اُنہی کے الفاظ میں پوری کی پوری سُنا دی۔ ابھی تک ٹیپ ریکارڈنگ کا کوئی عمل شروع نہیں ہوا تھا۔ استاد صاحب نے فرمایا تو تم نے سارے کا سارا درس مجھے میرے ہی الفاظ میں سُنا دیا ہے لہٰذا تم اس ترجمہ ئ قرآن کی کلاس میں

شرکت کیا کرو مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس سے بہت فائدہ حاصل ہو گا۔ بہر حال میں شریک ہو گیا اور سچی بات یہ ہے کہ اس ترجمۂ قرآن سے میں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ اس طرح وقت گذرتا رہا اور رجب کا مہینہ آ گیا۔ ہماری کلاسیں اختتام کو پہنچیں اور اعلان ہوا کہ اب امتحانات ہوں گے اور پندرہ شعبان سے رمضان المبارک کی چھٹیاں شروع ہو جائیں گی اور پھر پندرہ شوال سے نئے سال کی کلاسیں شروع ہوں گی۔ آخر کار چودہ رجب کو جامعہ رشیدیہ ساہیوال سے علامہ غلام رسول صاحب اور جناب حافظ مختار احمد صاحب ہمارا سالانہ امتحان لینے کیلئے تشریف لائے۔ میرا عربی زبان کا امتحان تو بہت اچھا رہا اور ممتحن صاحب نے میرے بارے بہت حوصلہ افزا رپورٹ لکھی۔ لیکن فارسی زبان کے ممتحن نے مجھے فارسی زبان میں کمزور قرار دیا۔ در اصل بات یہ تھی کہ کریمہ، نامِ حق اور پند نامہ کے بعد مجھے اُس کلاس میں شامل کر لیا گیا فقہ کی کتاب مالا بد منہ جو علامہ شیخ الاسلام قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تصنیف تھی وہ پڑھائی گئی۔ یہ کتاب اگرچہ فارسی زبان میں تھی اصلاً یہ فقہ کی کتاب تھی اس کے سمجھنے کے لئے مجرد فارسی زبان ناکافی تھی کیونکہ اصل میں تو یہ فقہی مسائل تھے جو عربی زبان میں بیان کیے گئے تھے۔ لہٰذا اس کتاب کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کے ساتھ ساتھ اسلامی فقہ اور اس کے اصول و مبادیات کی واقفیت اور شناسائی ضروری تھی جو مجھے ابھی تک حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس فقہی پس منظر سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اس کتاب کے امتحان کے دَوران وہ نمبر نہ مل سکے جن کی مجھ سے توقع کی گئی تھی۔ تو یہ قصور نہ میرا تھا نہ فارسی زبان کا۔ بلکہ یہ اس نظامِ تعلیم کی کمزوری تھی جس میں طلباء کو علوم و فنون کی ابتدائی واقفیت اور معرفت دیئے بغیر ان فنون کو پڑھانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کمزوری دینی مدارس سے آج تک دُور نہیں ہو سکی۔ اس نصابِ تعلیم میں ایک بہت بڑی کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں کتابوں کے پس منظر اور ان کے مصنفوں کے پس منظر اور حالاتِ زندگی کے بارے میں طلباء کو کوئی آگاہی نہیں بخشی جاتی۔ اور نہ ہی اُنہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس مصنف کا تاریخی ماحول کیا تھا اور وہ علمی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کیا تھا جس میں کوئی مصنف زندگی گزار رہا تھا۔ یا وہ کیا حالات و اسباب و عوامل تھے جس کی وجہ سے مصنف کو یہ کتاب لکھنا پڑھی۔ نہ مصنف کے دَور سے آگاہی ہوتی ہے اور نہ ہی مصنف کے ذاتی احساسات کے بارے میں طلباء کو کچھ بتایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات طلباء کو کتاب کے مصنف کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اُس کے دَور کے بارے میں آگاہی تو بڑی بات ہے۔ اور اس نظامِ تعلیم کا ایک اور کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں فنون کو پڑھانے کی بجائے کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلباء کتابیں پڑھ لینے کے باوجود علوم کے بارے میں بالکل تہی دست رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حدیث کی مخصوص کتابیں پڑھ لینے کے باوجود ان طلباء میں سے محدث کم ہی بنتے ہیں۔ اور اسی طرح صرف و نحو کی کتابیں پڑھ لینے کے باوجود طلباء صرف و نحو کے مسائل سے آگاہ نہیں ہو پاتے۔ وہ تفسیر کی کتابیں پڑھ لینے کے باوجود مفسر نہیں بنتے۔ اور ادب اور بلاغت کی کتابیں پڑھ کر وہ عربی زبان اور اس کے فصاحت و بلاغت کے آداب و تقاضوں سے بالکل نابلد رہتے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ طلباء کو فنون پڑھائے جائیں۔ تمام توجہ فنون پڑھائے جانے پر ہونی چاہئے اور کتابوں کی قید اُٹھا دینی چاہئے۔ کتابوں کا انتخاب اساتذہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ اپنے اپنے فن کی جس جس کتاب کو چاہیں اور جس ترتیب اور تدریج سے وہ چاہیں اُسے پڑھائیں اور اس کا انہیں مکمل اختیار ہونا چاہئے۔ افسوس ہمارے دینی مدارس میں علوم پڑھا سکنے والے اساتذہ ہی ناپید ہو چکے ہیں۔ اور نوبت بایں جا رسید کہ فنون کی کتابیں اگر تبدیل کر دی جائیں اور ایک کتاب کی جگہ پر

کوئی دوسری فنی کتاب نصاب میں شامل کر دی جائے تو اس کو پڑھانے کے اہل اساتذہ کا ملنا ناممکن ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں ایسا ہوا کہ شرح جامی کی جگہ پر شرح ابن عقیل تجویز ہوئی لیکن کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ شرح جامی پڑھانے والے اساتذہ تو موجود تھے لیکن ابن عقیل پڑھانے والا ایک استاد بھی میسر و دستیاب نہ تھا۔ پھر اس نصاب کی ایک اور بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس مجرد پڑھانے، یاد کرنے، رٹّا لگانے اور سب کچھ حافظے میں محفوظ رکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ نئے مسائل پر تحقیق کرنے اور تحقیقی اسلوب و انداز کو اختیار کر کے اُسے تحریری انداز میں ضبطِ تحریر میں لانے کی صلاحیت پیدا کرنے کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ کم از کم ۱۹۶۰ء تک تو ہم یہی ماحول دیکھا۔ اس کے بعد کوئی تبدیلی آئی ہو تو اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ طلباء کو تحقیق و تالیف کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اُنہیں قلم و قرطاس سے کام لینے کی صلاحیت سے آراستہ کرنے کے رجحان کو پیدا کرنے کی طرف پوری توجہ دی جانی چاہئے۔ جو کچھ طلباء پڑھیں اسے تحریر میں لانے اور اپنے الفاظ میں بہتر سے بہتر تحریری اسلوب میں اُسے آگے منتقل کرنے کی تربیت دی جانی چاہئے۔ خود مجھے اس امر کا تجربہ ہے ہمارے ہاں دورانِ تعلیم کبھی کسی استاذ نے ہمیں تحریری اسلوب اختیار کرنے کی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ اور اس طرح تحریری ملکا پیدا کرنے اور قلم و قرطاس کی صلاحیت سے اپنے آپ کو آراستہ کرنے کے میدان میں ہمیں بہت زیادہ دماغی و ذہنی ریاضت سے گذرنا پڑھا۔ اگر بچپن کے ابتدائی ایام ہی میں ہمیں ادھر متوجہ کر دیا جاتا تو بعد میں ہم اس صلاحیت سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے ساتھ ملک و ملت کو بھی بے پناہ طور پر فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ نصابِ تعلیم کی بات چلی ہے تو ایک اور اہم اور بنیادی نقطے کی طرف توجہ دلا دینا بھی فائدے سے خالی نہ ہو گا۔ ہمارے اس دینی نصابِ تعلیم کا ایک بہت بڑا المیہ یا نقص یہ ہے اور اس سے ملک و ملت کو بے پناہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور اس کی جس قدر جلد تلافی کر دی جائے اُتنا ہی ملک و ملت کے بارے میں بے پناہ طور پر فائدہ مند ہو گا۔ ہمارے ہاں دینی مدارس میں ہوتا یہ ہے کہ صدیوں کی فرقہ ورانہ گروہ بندیوں کی وجہ سے ہر فرقہ اپنے اپنے گروہی احصار میں مقید ہو چکا ہے اور مادی مفاد پرستی کی وجہ سے اس گروہ بندی میں بے پناہ شدت اور حد درجہ کا تعصب بلکہ باہمی عداوت کے شدید رجحانات پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسجد سے مسجد سے ٹکرا رہی ہے اور مولوی مولوی سے برسرِ پیکار ہے۔ اور حالت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ اسلام کے علماء اور اسلامی مساجد عالمِ اسلامی میں ناپید ہیں۔ اسلامی مساجد کی بجائے فرقہ ورانہ مساجد ہیں اور مسلمان علماء کی جگہ پر فرقہ ورانہ علماء ہیں۔ گویا اسلامی مساجد ناپید اور مسلم اور اسلامی فقہاء اور علماء صفحہ ہستی سے اپنا وجود ختم کر چکے ہیں۔ اس سبب ہمارا وہ نظامِ تعلیم اور نصاب ہے جس کی طرف ہم اپنے دوستوں کو متوجہ کر رہے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی شخص حصولِ تعلیم کے لئے کسی مذہبی مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اسے اس فرقے کی فقہ پڑھائی جاتی ہے اور کتب فقہ پڑھا پڑھا کر اُس کا دماغ اُس فرقے کی نفسیات پر اس حد تک مستغرق کر دیا جاتا ہے کہ اُس کے دل دماغ آنکھ کان غرضیکہ اُس کے پورے وجود پر اُس کی فقہ پوری طرح غالب آ چکی ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے تو اسی فقہ میں، اور سانس لیتا ہے تو اسی فقہ میں حتیٰ کہ وہ اپنی اپنی فقہ کو کفر و اسلام کا مدار اور اساس و بنیاد قرار دے دیتا ہے۔ اور اس کا ذہن یہ بنا دیا جاتا ہے کہ اسلام وہی ہے جو اس کی فرقہ ورانہ فقہ کے مطابق ہو اور مسلمان وہی ہے جو اس کی اس فرقہ ورانہ فقہ کو صحیح مانتا ہو۔ گویا اسلام مقید ہو جاتا ہے اس فرقہ ورانہ فقہ میں اور کفر و اسلام کے فیصلہ بھی اس فرقہ ورانہ فقہ کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ اور آخر کار مسلمان صرف وہ رہتا ہے جو

اس کی اس فرقہ ورانہ فقہ کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ اور ہر وہ شخص اس کے نزدیک کافر قرار پاتا ہے جو اس کی اس فرقہ ورانہ فقہ کے معیار پر پورا نہ اُترتا ہو۔ جب اُس کا فقہی ذہن اس حد تک پختہ ہو جاتا ہے تو وہ ہر چیز کو اپنی اس گروہ بندانہ فقہ کی رنگین عینک سے دیکھنے کا کلی طور پر عادی ہو چکا ہوتا ہے اور یہ فرقہ ورانانہ فقہ اُس کی رگ رگ میں رچ بس چکی ہوتی ہے اور اسی کی کسوٹی پر وہ کفر و اسلام کے فیصلے کرنے کا وہ سو فیصد عادی ہو چکا ہوتا ہے تو اب اسے حدیث پڑھائی جاتی ہے۔ وہ علوم حدیث کا اور کتب احادیث کے متون کا اپنی فرقہ ورانہ فقہ کی روشنی میں مطالعہ کرتا ہے۔ جو حدیث اس کی اپنی فقہ کے معیار پر پوری نہ اُترے خواہ وہ بخاری و مسلم صحیح ترین حدیث ہی کیوں نہ ہو وہ یا تو اس کا آغاز ہی میں انکار کر دیتا ہے یا وہ اس کی کوئی ایسی تاویل یا توجیہ کرتا ہے کہ جس کے نتیجے میں وہ صحیح ترین حدیث اس کی فقہ کے ساتھ مطابقت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر کے بعد وہ قرآنِ حکیم اور اُس کے علوم پڑھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اب وہ یہاں بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے کہ وہ قرآن اور اس کے علوم کا بھی اپنی اسی فقہ کے زاویہ نگاہ سے مطالعہ کرتا ہے اگر کوئی قرآن کی صریح آیت اُس کی اس فقہ یا اس کی اس حدیث اور اُن کی توجیحات کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تو وہ صریح آیت کی تلاوت تو کرتا رہتا ہے لیکن اُس کی حاکمانہ حیثیت ختم کر دیتا ہے۔ مانتا قرآن کو اللہ تعالیٰ کی ہی کتاب ہے لیکن وہ اس کی صرف ثواب کے حوالے سے تلاوت کرتا ہے وہ ثواب کہ جس کے مفہوم، مدلول اور مقصود سے بھی وہ حقیقی طور پر آگاہ نہیں ہوتا وہ اُس کے حصول اور اپنے یافتہ ماں باپ اور عزیزو اقارب تک اُس کا ثواب پہنچانے میں مصروف رہتا ہے۔ لیکن اپنی مذہبی زندگی کے مسائل و معاملات اور عقائد و اعمال کو اپنی اپنی گروہ بندانہ فقہ یا اُس کے معیار پر پوری اترنے والی احادیث کی ہی روشنیں انجام دیتا رہتا ہے۔ آج امت کا المیہ یہ ہے کہ اُس کی کتابِ حیات یعنی قرآن پاک مردوں کو بخشوانے کے لئے قبرستان کی کتاب بن چکی ہے جو صرف ثواب حاصل کرنے کے لئے ناظرہ خوانی کی حد تک موقوف ہو چکی ہے۔ اور مذہبی زندگی کے مسائل و معاملات کے صحیح و غلط ہونے کے فیصلے اس حیات بخش روح پرور اور علم و حکمت خیز کتابِ الٰہی کی بنیاد پر نہیں کیے جاتے آج آپ جدھر دیکھیں اُدھر ہی بڑی رقت آمیز دعائیں سُنائی دیں گی۔ مسجدیں ہوں یا خانقائیں۔ جبل عرفات ہو یا منیٰ مزدلفہ، حرمین کی مساجد ہوں یا مسجد اقصیٰ۔ ہر جگہ رو رو کر دعائیں مانگی جا رہی ہیں لیکن کہیں بھی کوئی دعا شرفِ قبولیت حاصل کرتی نظر نہیں آتی۔ سبب کیا ہے؟ سبب یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کے لئے حصولِ رحمت کلامِ الٰہی کی اتباع سے مشروط کیا گیا ہے۔ دیکھئے ۱۵۵/۶، ۲۰۴/۷ بس جب تک یہ امت کتاب اللہ کی انفرادی اور اجتماعی علمی اور عملی دینی اور دنیاوی، ثقافتی اور تہذیبی تابع اور مطیع نہیں ہو گی یہ کبھی بھی رحمتِ الٰہیہ سے بہرہ ور نہیں ہو سکے گی۔ اور اگر یہ اس حوالے سے کتاب اللہ کی تابع ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ اس شرط کو پورا کرنے کے بعد اللہ کی رحمتیں خود بخود اس امت پر کتاب اللہ کی اتباع کے بعد سایہ فگن ہو جائیں گی۔ پس اس مقام تک پہنچنے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں موسلا دھار کے طور پر برسیں۔ شرط یہ ہے کہ پوری امتِ مسلمہ فرقہ واریت سے تائب ہو کر اپنے آپ کو انفرادی اور اجتماعی، علمی اور عملی، غرضیکہ کہ ہر حوالے سے کلی اور اجتماعی طور پر کتاب اللہ کی محکوم اور اس کی تابع اور حامل بن جائے۔ اس مقام کا حصول اس کے سوا کسی اور سورت میں نہیں ہو سکتا کہ سب سے پہلے دینی اور دنیاوی تعلیم گاہوں میں طلباء کو عربی زبان اس حد تک پڑھا دی جائے کہ یہ طلباء براہِ راست قرآنِ حکیم کا مطالعہ کر کے اس سے مستفیض ہونے اور زندگی کے تمام معاملات

میں کتاب اللہ سے براہِ راست ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی اہلیت وصلاحت سے مالا مال ہو جائیں۔ جب اُن میں اس درجے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو اس کے بعد قرآنِ حکیم کی روشنی میں فقہی علوم و آداب کا مطالعہ کرایا جائے۔ اور اسی قرآن کی روشنی میں اُنہیں حدیث و سنت کے علوم و فنون کا مطالعہ کرنے کے آداب اور تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کی اہلیت وصلاحیت سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے۔ اس طرح جب زندگی کے تمام مسائل و معاملات قرآن حکیم کی کسوٹی پر پرکھنے کی باء میں استعداد و صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو اس طرح اس سعادت کے دَور کا دوبارہ آغاز ہو گا جس کا صدیوں سے اس امت کو انتظار ہے۔ بات ہم اُس ماحول کی کر رہے ہیں جس میں میں دار العلوم عثمانیہ کے دوسرے سال کے نصابِ تعلیم کے پڑھنے کے لئے حاضر ہو رہا تھا۔ پہلا سال جس طرح پہلے عرض کیا ہے مجھے پورا نہ ملا تھا میں تین چار میں کی تاخیر سے دار العلوم عثمانیہ پہنچا۔ دن رات کی محنت سے تلافی مفات کرنے کی کوشش کرتا رہا اسی حد تو یہ تلافی ہوئی یا ہو سکی لیکن کلی طور پر میں اس میں کامیات نہ ہو سکا۔ اب چونکہ میں سال کے آغاز ہی میں دار العلوم پہنچ گیا تھا لہٰذا میں نے موجودہ سال کی کتابوں کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ گذشتہ سال کی چھوٹی ہوئی کتابون پر توجہ دینے کے لئے بھی میں نے کچھ ٹائم مخصوص کر لیا۔ یہ بتانا تو میں یہاں بھول ہی گیا کہ پہلے سال کے چند مہینوں میں جو کچھ میں نے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی اس کا اثر میرے دیہاتی ماحول پر کیا ہوا۔ میں ترجمہ قرآن از خود کر لینے کی منزل سے تو ابھی کوسوں دور تھا لیکن قرآن حکیم کے ساتھ جتنی عربی پڑھ لی تھی اس سے اتنی شناسائی پیدا ہو گئی کہ میں کسی دوسرے کو اگر قرآن پڑھتے سنتا تو اسے بتا دیتا کہ جو الفاظ وہ پڑھ رہا ہے اس پر زبر ہو گی یا زیر۔ پیش ہو گی یا جزم۔ اس سے ہماری دیہاتی خواتین انتہائی طور پر حیرانگی کا اظہار کرنے لگتیں۔ جب وہ تلاوت کے دَوران کوئی لفظ پڑھتیں اور میں اُنہیں بتا دیتا کہ اس لفظ پر فلاں جگہ زیر زَبر پیش یا جزم ہو گی تو اُنہیں حیرانگی ہوتی۔ وہ مجھے پوچھتیں کہ کای تم نے اتنی کم مدت میں قرآن مجید حفظ کر لیا ہے جو تجھے ہر قرآنی لفظ کی حرکات و سکنات سے آگاہی ہو گئی ہے میں اُنہیں بتاتا نہیں ایسا نہیں ہوا میں نے قرآن حفظ نہیں کیا لیکن جتنی عربی زبان پڑھ لی ہے اس سے مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ کس لفظ پر کونسی حرکت آئے گی۔ غرضیکہ کہ اس سے میرے دیہاتی ماحول بہت خوشگوار تبدیلی محسوس کی گئی۔ اور بہت سی ماؤں نے اپنے بچوں کو میرے ساتھ میرے دارالعلوم میں پڑھنے کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ عملی طور پر تو دو چار بچے ہی میرے ساتھ آئے لیکن وہ بھی یہاں کے ماحول سے مانوس نہ ہو سکے اور دو چار ہفتوں کے بعد جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی جا پہنچے۔ غرضیکہ اب دوسرے سال کا آغاز ہوا فارسی زبان کے حوالے سے گلستانِ سعدی کے ساتھ بوستانِ سعدی کا آغاز ہوا اور ان دونوں کتابوں کو پڑھ لینے کے باوجود علم و معرفت کے حوالے سے میرے اندر ان کتابوں کے لئے کوئی خاص کشش پیدا نہ ہو سکی۔ البتہ ان کتابوں کے پڑھ لینے سے میرے اندر فارسی زبان کی اتنی استعداد پیدا ہو گئی کہ میں فارسی زبان میں لکھی گئی فقہ اور صرف و نحو کی کتابیں سمجھنے کا اہل ہو گیا البتہ اس دوسرے سال میرا اصل زور عربی زبان کے صرف و نحو کو پڑھنے اور اس کے علوم و مسائل کو سمجھنے کے لئے دن رات خرچ ہونے لگا۔ ہمارا معمول یہ تھا کہ ہماری کلاسیں صبح آٹھ بجے شروع ہوتیں اور بارہ بجے تک یہ کلاسیں مسلسل جاری رہتیں۔ ان اوقات میں گذشتہ پڑھائے گئے اسباق کو سنا جاتا اور نئے اسباق پڑھائے جاتے اور آخری گھنٹے میں طلباء ایک دوسرے کے ساتھ ان اسباق کا اعادہ کرتے۔ ایک دوسرے سے سنتے بھی اور سناتے بھی۔ اگرچہ یہ رجحان مفقود تھا کہ استاد پر سبق پڑھنے کے دَوران کوئی سوال کیا

جائے کیونکہ سمجھا یہ جاتا تھا کہ سوال کرنا اعتراض کرنا ہے اور اس طرح استاذ کے اعتماد کو مجروح کرنا ہے۔ ذہن یہ بنایا جارہا تھا کہ جو کچھ استاذ پڑھائے اس کو خوب اچھی طرح سن کر سمجھ لیا جائے اور اسے اچھی طرح یاد کر کے حافظے میں بٹھانے کی کوشش کی جائے۔ جہاں تک نئے اسباق کو اپنے طور پڑھ کر آنے کا سوال ہے تو اس کی بھی کوئی زیادہ پوچھ گچھ نہیں ہوتی تھی کوئی ایک طالب علم جو اچھی استعداد وصلاحیت کا مالک ہوتا تھا وہ عربی کتابوں کی روانی کے ساتھ تلاوت کر دیتا تھا اور استاذ اس کی اس تلاوت شدہ عبارت کی پنجابی یا اُردو زبان میں وضاحت کر دیتے تھے۔ ایسا کم ہوتا تھا اگر کلاس کو گذشتہ سبق فرداً فرداً یاد نہ ہو تو اگلے نیا سبق نہ پڑھایا جائے۔ ایسا رجحان نہ تھا۔ اصل رجحان یہ تھا کہ ہر روز پڑھایا جائے اُسے سُنا جائے اور اس طرح کتا ب ختم کر دی جائے۔ گویا کتابیں پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کا رجحان غالب تھا۔ جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ جس فن کو پڑھا جارہا ہے اس کو سمجھا جائے اور اس فن کی روشنی میں زندگی پر اس کا اطلاق کیا جائے اور زندگی کے مسائل ومعاملات کا اس فن سے کوئی قریبی یا بعیدی تعلق ہے تو اس تعلق کی روشنی میں اُس فن کا استعمال کیا جائے اس طرح کا رجحان بھی ہمارے ہاں ناپید تھا۔ اس سال میرا زیادہ زور معلم عربی کے دوسرے اور تیسرے حصے پر تھا۔ کیونکہ یہ دونوں حصے اس سال میرے نصاب میں شامل تھے۔ مجھے معلمِ عربی کے پڑھنے میں بہت مزہ آتا تھا اور ان کی تمرینات کرنے اور عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی کرنا بھی میرے لئے بے پناہ دلچسپی کا باعث بنتا تھا لیکن میرے علاوہ دوسرے طلباء کو اس کتاب سے دلچسپی نہ تھی اور بالخصوص اس کی عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی والی مشکوں سے تو وہ بالکل کنی کتراتے اور اُن سے دامن بچا کر نکل جانے کے متمنی ہوا کرتے۔ بڑی مشکل سے حصہ دوم ختم ہوا۔ تیسرا حصہ پڑھنے کے لئے طلباء نے یہ شرط لگادی کہ وہ تب پڑھیں گے جب اس کی اُردو اور عربی مشکوں کو حل کرنے کا اُن سے مطالبہ نہ کیا جائے۔ استاذ نے کہا کہ ایسا کرنے سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہو گا۔ طلباء نے کہا کہ استاذ صاحب یہ کتاب کب لکھی گئی۔ یہی کوئی ۱۹۴۰ء میں۔ طلباء نے کہا کیا اس سے پہلے اکابر عربی نہ پڑھتے تھے۔ جن کتابوں سے وہ عربی پڑھتے تھے وہی کتابیں ہمیں پڑھائی جائیں کیونکہ وہ بابرکت کتابیں تھیں جو بابرکت بزرگوں نے لکھیں اور بابرکت بزرگوں نے پڑھیں۔ ہم بھی صرف وہی بابرکت کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس بے برکتی اور نحوست کے دَور میں لکھی گئی کتابیں پڑھانے پر آخر کیوں اصرار کیا جاتا ہے۔ استاذ صاحب اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکے انہوں نے اتنا ہی کہا کہ جیسے تم چاہتے ہو ویسے ہی کر لو اور جو قدیم دور میں کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جیسے نحو میر اور ایساغوجی جیسی کتابیں کل سے کتب خانے سے جاری کروا لو ہم تمہیں وہ پڑھانی شروع کرا دیں گے۔ میں طلباء کے اس طرزِ عمل سے بہت مایوس ہوا بلکہ مجھے رونا آگیا۔ استاذ صاحب نے پوچھا کفایت اللہ تم کیوں رو رہے ہو میں نے کہا مجھے معلمِ عربی پڑھنے میں مزہ آتا ہے اور اس کی مشکیں کرنے سے مجھے بے پناہ خوشی ہوتی ہے اور میں اپنے اندر عربی زبان کا ملکہ پیدا ہوتا دیکھتا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ کوئی اور پڑھے یا نہ پڑھے مجھے آپ معلم عربی کے چاروں اجزاء بمع تمرینات کے پڑھا دیں۔ استاذ صاحب نے ازراہِ شفقت فرمایا جب پوری کلاس اس کتاب کو پڑھنے سے گریزاں ہے تو صرف تنہاء تجھے یہ کتاب پڑھانا کلاس کے اوقات میں تو ممکن نہیں البتہ تم مغرب سے عشاء کے دَوران مجھ سے یہ کتاب پڑھ سکتے ہو۔ میں نے اسے غنیمت جانا اور استاذ صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن کی اس پیشکش کو پورے شوق وذوق سے قبول کر لیا۔ پس دوسرے سال ہمارے لیے شرح مائۃ عامل اور نحو میر پڑھانے کا فیصلہ ہوا۔ یہ دونوں کتابیں

عربی زبان میں لکھی ہوئی تھیں لیکن عربی نہایت آسان اور ان کا اسلوب اور اندازِ تحریر نہایت کشش و جاذبیت کا حامل تھا۔ مجھے یہ پڑھ کر بہت لطف آیا اور ان دونوں کتابوں سے میں نے بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا بلکہ میں نے انہیں اتنی توجہ اور محنت سے پڑھا کہ ان کا ایک ایک لفظ میرے حافظے میں نقش ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میں نے عربی معلم کا حصہ دوم بھی بمع مترینات کے استاذ صاحب سے پڑھ لیا۔ سال کے اختتام پر میں نے یہ محسوس کیا کہ گویا میں قرآنی الفاظ سے مانوس ہو گیا ہوں اور ان الفاظ کی حرکات و سکنات سے کافی حد تک مجھے آگاہی حاصل ہو گئی ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں بعض دوستوں کے ساتھ سورۃ المؤمنون کی تلاوت کر رہا تھا اس تلاوت کے دوران جب میں اس سورۃ کی آیت نمبر ۳۳ تک پہنچا تو اس میں یاکل اور تاکلون اور یشرب اور تشربون کے الفاظ موجود تھے میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا کہ ان الفاظ کا کیا معنیٰ ہے کہنے لگے کہ کوئی ترجمے والا قرآن لے آؤ اور پڑھ لو میں نے کہا کیا یہ اکل یاکل سے یاکل نہیں ہے اور کیا تاکلون اسی سے جمع مخاطب مذکر کا صیغہ نہیں ہے اور اسی طرح یشرب شرب یشرب واحد مذکر غائب اور تشربون اسی سے جمع مذکر مخاطب کا صیغہ نہیں ہے انہوں نے کہا ہمیں کیا خبر ترجمہ والے قرآن سے دیکھ لو۔ میں نے کہا اس میں دیکھنے والی کون سی چیز ہے۔ غرض یہ کہ میرے ساتھ طلباء اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ لیکن میں اس تلاوت میں جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا مجھ پر ترجمہ قرآن خود بخود کھلتا گیا۔ میں ایک ایک لفظ کو پہنچاننے لگا کہ یہ فعل ہے یا اسم۔ حرف ہے یا کوئی اور چیز فعل ماضی ہے یا مضارع، واحد ہے یا جمع اور زبر والا ہے تو کیوں۔ کہیں زیر آئی ہے تو کیوں۔ غرضیکہ کہ اُس دن سے میری یہ حالت ہوئی کہ جہاں کہیں سے میں قرآن پڑھتا تھا میں اُسے بغیر کسی مترجم کی مدد سے اُسے سمجھنے کا اپنے آپ کو اہل پا رہا تھا مجھے اس سے اتنی خوشی ہوئی کہ جیسے میں نے قارون کے خزانے کو پا لیا ہے اور میری والدہ نے میرے بارے میں جو دعائیں مانگی تھیں اُن کی شرف و قبولیت کی ابتدائی منزل کو میں نے چھو لیا ہے۔

ان آیات کے ترجمے سے آگاہی پا لینے کے بعد اگلے دن نمازِ فجر کے بعد جب قرآنِ حکیم کی تلاوت کا آغاز کیا تو وہ سورۃ الفرقان کی ابتدائی آیات تھیں۔ جیسے جیسے میں اس تلاوت میں آگے بڑھتا گیا میں نے ترجمے والے قرآن سے اپنی توجہ ہٹالی اور عربی متنِ قرآن پر پوری توجہ مرکز کر دی۔ میں حیران ہوا کہ افعال کے ماضی اور مضارع معروف اور مجہول جیسے پہلوؤں سے گویا میں آگاہ ہو چکا تھا حتیٰ کہ میں مجرد اور مزید فیہ افعال کے بارے میں کوئی دقت پیش آ رہی تھی میں اپنے معمول سے ایک گھنٹہ زیادہ تلاوتِ قرآن میں مصروف رہا اور فرقان سے سورۃ القصص کی آخری آیات پر پہنچ کر میں نے اس تلاوت کو ختم کر دیا۔ اب میرے اندر یہ احساس یقین کی صورت میں ڈھل گیا کہ میں بغیر کسی مترجم کی مدد سے براہِ راست حقائق و معارفِ قرآن کی شارح پر قدم رکھ چکا ہوں۔ اس غیر معمولی خوشی کے احساس کے ساتھ میں نے فجر کے بعد کا کھانا کھایا اور کمرہ ئ جماعت میں چلا گیا۔ اس دوران میں میزان منشعب صرف بہائی اور علم الصیغہ کی کتابیں جو فارسی زبان میں تھیں اُنہیں پڑھ چکا تھا۔ اسی طرح علم النحو کے دونوں حصے اور کتاب النحو اور کتاب الصرف کے دونوں اجزا اور پھر نحو میر عربی زبان میں پڑھ چکا تھا۔ اس کے بعد علم الصیغہ کے فوراً بعد فصول اکبری اور نحو میر کے ساتھ ہدایت النحو اور اس کے بعد کافیہ پڑھنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ معلمِ عربی کے دونوں حصے ختم کر چکا تھا۔ ترجمتین کی تمام تمرینات حل کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ نفحۃ الیمن اور اظہار الادب اور اس سے پہلے روضۃ الادب کے تمام ابواب بھی ختم کر چکا تھا۔ مزید براں یہ کہ نمازِ فجر کے

بعد ہونے والے درستِ قرآن کو دو سال سے بلاناغہ مسلسل سن چکا تھا۔ اور جنابِ پرنسپل صاحب کے ہاں سے پہلے پارے سے بیسویں پارے تک ترجمہ قرآن کر چکا تھا۔ ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ مرتب ہوا تھا کہ قرآنِ حکیم کو جہاں سے بھی میں کھولتا تھا اس کے اعراب اور حرکات کے حوالے سے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ اس سال کی ابتداء ہی میں اکیسویں پارے سے ترجمۃ القرآن کا آغاز ہوا اور علم الصیغہ اور کافیہ کے اسباق شروع ہوئے۔ اس کے ساتھ نفحۃ العرب جو ادبِ عربی کے حوالے سے ایک بہت مفید کتاب ہے وہ شروع کرائی گئی۔ البتہ اس امر کا اظہار کر دینا شاید باعثِ تعجب ہو گا کہ منطق میں تہذیب، تہذیبِ منطق، ایساغوجی، شرح تہذیب اور سلم العلوم جیسی منطق کی کتابیں کے دروس میں جب میں حاضر ہوتا تو میری طبیعت پر انقباض طاری ہو جاتی۔ البتہ جب فقہ اصول فقہ حدیث، اصولِ حدیث، قرآن اور اس کی تفاصیل جیسے جلالین اور بیضاوی جیسی کتابیں پڑھتا یا ان کے دروس میں شامل ہوتا تو طبیعت میں بہت انشراح پاتا۔ فقہ میں سب سے پہلے قدوری اور کنز وغیرہ پڑھ لی تھیں اور شرح وقایہ کا درس شروع ہو چکا تھا۔ چونکہ اس مدرسے کا تعلق علمائے احناف سے تھا اور احناف کے ہاں حدیث اور اس کے علوم سے زیادہ فقہ اور اس کے مسائل کے پڑھائے جانے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس لئے ابھی تک حدیث کی کوئی کتاب شروع نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال یہ تیسرا سال خیر وخوبی سے گزر گیا اور اس میں جلالین کا کافی حصہ اور قرآن کا مکمل ترجمہ ہو گیا۔ شرح وقایہ تک فقہ حنفی بھی پڑھ لی اور قرآن اور اس کے اعراب و حرکات سے بھی کافی حد تک آگاہی ہو گئی اور اس طرح براہِ راست قرآنِ حکیم سے معرفت وشناسائی کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ اس دوران مجھے تقریر کرنے اور خطبہ جمعہ پڑھانے کا بھی آغاز ہو گیا۔ بعض اوقات بڑی اہم اور مرکزی مساجد میں مجھے خطبہ جمعہ دینے کا اتفاق ہوا۔ لوگوں نے میری خطابت کے بارے میں بہت اونچے تاثرات اور بہت اعلیٰ توقعات کا اظہار کیا۔ بعض مواقع پر مجھے عطاء اللہ شاہ ثانی مرحوم اور علامہ حفظ الرحمٰن سیوہاوی مرحوم کے مشابہ یا ان کا ثانی قرار دیئے جانے کے احساسات بھی میرے سامنے ظاہر ہوئے۔ بہر حال اس سال کے اختتام پر جب میں گھر پہنچا تو میں درسِ قرآن دینے کے قابل تھا۔ بہر حال رمضان میں میں نے نمازِ فجر کے بعد ترجمہ قرآن کے حوالے سے درسِ قرآن شروع کر دیئے۔ جمعے بھی پڑھائے اور ارد گرد کے دیہات میں سیرت النبی کے اجتماعات میں خطاب کرنے کے مواقع بھی حاصل ہوئے۔ دن بڑی جلدی سے گذر گئے اور میں چوتھے سال کے لئے دار العلوم عثمانیہ میں آحاضر ہوا۔ اس دوران ایک اور تجربہ ہوا جس کا ذکر کر دینا افادیت سے خالی نہ ہو گا۔ ہوا یوں کہ میرے بعض رشتے دار جو عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے اور بڑے بڑے دار العلوموں میں درسیات میں مشغول تھے انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور آکر کہا کہ فلاں مدرسہ بہت اچھا ہے وہ روٹی بہت اچھی ملتی ہے بلکہ سال میں دو دفعہ گرما اور سرما موسم کے حوالے سے بہت قیمتی جوڑے بھی دیئے جاتے ہیں اور ساتھ کے ساتھ بڑے بڑے اساتذہ مختلف علوم و فنون پڑھانے میں بہت زبردست شہرت رکھتے ہیں۔ آؤ ہم اپنے اپنے موجودہ مدارس کو چھوڑ کر چنیوٹ، فیصل آباد اور گجرات وغیرہ چلیں۔ سیر وسیاحت بھی ہو جائے گی اور گھوم پھر کر طبیعت بھی بہت خوش ہو گی۔ میں نے اُنہیں جواب دیا کہ میں ایسا نہیں کروں گا جب تک میرے اساتذہ مجھے یہ نہ کہیں گے کہ اب ہم تجھے مزید پڑھانے کے اہل نہیں رہے اس وقت تک میں ان اساتذہ کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ میری طبیعت ان اساتذہ سے پڑھ کر

دلجمعی سے پڑھا رہے ہیں میں ان سے پوری محنت اور تن دہی کے ساتھ پڑھتا رہوں اور جو وقت میں نے آوارہ گردی میں ضائع کرنا ہے اُسے میں خارجی مطالعہ کرتا رہوں۔ میں نے اساتذہ سے سنا ہے کہ دینی مدارس کے طلباء کو تحصیلِ علم کے دوران ایک مرض لاحق ہوتا ہے اس مرض کو ثماخیرا کہا جاتا ہے جس کا معنٰی یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ جس مدرسے میں وہ پڑھ رہا ہے نہ وہ مدرسہ اچھا ہے نہ ہی اساتذہ اور نہ ہی کھانے پینے کا انتظام اچھا ہے۔ اس کے برعکس فلاں مدرسہ بہت اچھا ہے وہاں کے اساتذہ بہت قابل ہیں اور وہاں کے کھانے پینے کے نظام کا کیا کہنا۔ وہ نہایت پُرکشش اور جاذبیت کا حامل ہے۔ نتیجتاً طلباء کسی ایک جگہ ٹک کر نہ استاذ سے پوری طرح سیکھتے ہیں اور نہ ہی اساتذہ کی قدر افزائی کرتے ہیں۔ اُن کا ذہن کتابوں میں نہیں لگتا بلکہ دوسری جگہوں کی سیر وسیاحت کے حسین خواب دیکھنے میں اُن کا دل دماغ الجھا رہتا ہے۔ میں نے اپنے ان بزرگ رشتہ داروں سے کہا آپ نے جہاں جانا ہے جائیں میرے لئے تو یہی میرے اساتذہ کافی ہیں۔ اور دارالعلوم عثمانیہ کی فضا اور ماحول سے میں بہت مانوس ہو گیا ہوں۔ میں از خود اس ماحول کو چھوڑ کر کسی دوسرے ماحول میں جانے کا روادار نہیں ہوں۔ میرے یہ بڑے بزرگ مجھے طعن و تشنیع کرتے اور کنویں کا مینڈک قرار دیتے ہوئے میرے ہاں سے چلے گئے۔ بہر حال میں نے چوتھے سال کا آغاز کیا لیکن اس سال کے نصف میں ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رُخ کافی حد تک تبدیل کر دیا۔ ہوا یوں کہ میں چوتھے سال کے وسط میں اپنے ماموں مرحوم علامہ ثناء اللہ فاضلِ جامعہ امینیہ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے نزدیک وہ ایک ولی کامل اور فاضلِ اجل اور متبحر عالم دین تھے۔ افسوس کہ پاکستان مہاجرت کے بعد انہوں نے بجائے کسی بڑے شہر کی جامع مسجد میں ڈیرہ لگانے کے وہ ایک ایسے گاؤں میں فروکش ہوئے جہاں علم اور علماء کی قدر افزائی اور ان سے استفادہ کے کوئی امکانات نہ تھے۔ اس طرح اُن کی غیر معمولی علمی صلاحیتوں سے ملک وملت کچھ زیادہ فیض یاب نہ ہو سکے حتیٰ کہ اُن کی اولاد بھی اُن سے وہ علوم و معارف نہ حاصل کر سکی جن کا حصول اُن کے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔ اُن کے بڑے بیٹے علامہ غلام یٰسین جو ابھی تک بقیدِ حیات ہیں انہوں نے جامعہ انوریہ سے سندِ فراغت تو حاصل کر رکھی ہے لیکن اپنے عظیم والد کے عظیم و عرفانی ورثہ سے کچھ زیادہ بہرہ ور نہیں ہو سکے۔ بہر حال میں انہیں وقتاً فوقتاً ملنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ اس دفعہ جب میں اُن کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو وہاں مرحوم علامہ مودودی صاحب کی کتاب تنقیحات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یہ کتاب بہت پسند آئی اور اس کے عقلی اور استدلالی اسلوب و اندازِ بیان نے میرے دل دماغ پر کافی زیادہ اثر کیا۔ آتی دفعہ انہوں نے مجھے از راہِ عنایت یہ کتاب عطا فرما دی۔ اور فرمایا کہ تم نے ایک دو دن میں اس کتاب کو جس دلچسپی اور لگن سے پڑھا ہے اسے دیکھ کر مجھے بہت حیرانگی ہوئی ہے۔ میں نے تیرے استغراقِ مطالعہ کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ کتاب تو لے جا اور پڑھ لے۔ ہم تو مکتبہ دیوبند سے پوری طرح متفق ہیں اس سے ادھر اُدھر ہونا ہمارے بس میں نہیں۔ تو نوخیز طالبعلم ہے ہو سکتا ہے کہ تیرے اندر ابھی مکتبہ دیوبند کے ساتھ وہ وابستگی نہ ہو جو ہماری ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تجھے مودودی صاحب کا مطالعہ کرنے میں کوئی ذہنی الجھن پیش نہ آتی ہو۔ ہمارا ذہن اکابر کے زیرِ اثر ایسا بن چکا ہے کہ ہم علامہ مودودی صاحب کے بعض افکار سے توحش محسوس کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی کتابوں کا کشادہ نگہی سے مطالعہ کرنے میں ہمیں کافی دقّت پیش آتی ہے۔ یہ کتاب تقریباً چھ ماہ سے میرے سامنے پڑھی ہے لیکن میں اسے ختم کرنا تو کجا دلجمعی سے اسے شروع بھی نہ کر سکا۔ چند صفحات پڑھتا ہوں اور پھر چھوڑ دیتا

ہوں۔ تو اسے لے جا شاید تو اسے پورا پڑھ لے میں یہ کتاب لے کر بہت خوش ہوا اور میں نے راستے ہی میں اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ جب میں شام کو دارالعلوم عثمانیہ پہنچا تو میں اسے ختم کر چکا تھا۔ اگلی صبح پھر میں اسے پڑھنے میں وقتاً فوقتاً مصروف رہا آہستہ آہستہ ایک ہفتہ لگا کر دوبارہ اسے ختم کیا۔ علامہ مرحوم کے طرزِ استدلال نے میرے اوپر اس حد تک قبضہ کر لیا کہ میں اُن کی بقیہ کتب اور مکالات کے پڑھنے کے لئے بے تابانہ وار اُن کی تلاش میں نکل پڑا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ علامہ صاحب پاکستان میں کہاں رہتے ہیں اور ان کی کتابیں کہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ بہر حال میں اُن کی تلاش جاری رکھی۔ اور آہستہ آہستہ اس تلاش سے میرے اوپر یہ امر منکشف ہوا کہ یہ علامہ صاحب اس وقت لاہور میں رہتے ہیں ان کی زیرِ ادارت ایک ماہنامہ ترجمان القرآن ہر ماہ چھپتا ہے اور یہ جماعت اسلامی کے امیر ہیں۔ اور لاہور میں ذیلدار پارک میں ان کی رہائشگاہ ہے۔ ان کی جماعت کے پاکستان کے ہر شہر اور قابلِ ذکر قصبات میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ اور ان کا تمام لٹریچر جماعت کے قائم کردہ دارالمطالعوں میں مل جاتا ہے۔ اب میں اس امر کی تلاش میں لگ گیا کہ مجھے اوکاڑہ میں کوئی ایسا آدمی ملے جو مجھے جماعت اسلامی کے قائم کردہ دارالمطالعہ میں پہنچنے میں مدد دے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں نمازِ جمعہ پڑھنے میں مصروف تھا کہ ایک چھوٹے قد کے بزرگ جنہوں نے سر پر جناح کیپ پہن رکھی تھی۔ اور ان کے دائیں بائیں اُنہی کے ہم شکل بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک بچے کے ہاتھ میں کوئی متوسط سائز کی ایک کتاب تھی جس کا نام تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اتنا پتہ چل رہا تھا کہ یہ علامہ مودودی صاحب کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ نمازِ جمعہ کے بعد میں اس بزرگ کے پیچھے پیچھے چل دیا حتیٰ کہ میں نے اُسے حق بازار میں ایک ہومیوپیتھک کلینک میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس امر سے آگاہ ہو جانے کے بعد میں کلینک میں داخل نہ ہوا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کو میرے بارے میں پتہ چلے کہ میں اس کلینک میں آ جاتا ہوں اور کوئی طالبعلم مجھے یہاں دیکھ کر پرنسپل صاحب کو میری شکایت نہ لگا دے۔ میرا معمول تھا کہ میں عصر سے مغرب تک شہر سے باہر گھومنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں اُس بازار سے گذر تھا کہ اچانک وہی بزرگ مجھے آگے دکھائی دیئے۔ میں نے اُن کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ ہمارے مدرسے سے کافی دُور ہو گئے۔ تو میں نے اُنہیں ایک مکان میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن سے اپنا طالبعلمانہ تعارف کروایا اور کتاب تنقیحات کا مطالعہ کر لینے اور اس کے دل دماغ پر مرتب ہونے والے اثرات سے اُنہیں آگاہ کیا۔ اور اسے درخواست کی کہ اگر وہ مجھے علامہ صاحب کی اور کتابیں مطالعہ کے لئے دے سکے تو میں اُن کا ممنونِ احسان ہوں گا۔ اُن کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے اور فرمایا کہ میرا نام عبد الغنی ہے اور پیشہ ہومیوپیتھک علاج معالجہ کرنا ہے۔ اور تمہارے مدرسے کے قریب ہی میرا ہومیوپیتھک کلینک ہے تو وہاں سے جو کتاب چاہو لے سکتے ہو کیونکہ میری ذاتی لائبریری میں علامہ صاحب کی ہر کتاب موجود ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں کلینک پر آ کر کوئی کتاب لینے کی بجائے آپ کے گھر سے اور وہ بھی مغرب کے بعد کتاب لینے کو ترجیح دوں گا۔ اُنہوں نے کہا کیا تجھے میرے کلینک میں آنے سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا کیوں؟ کیا میری کوئی ڈرونی شکل ہے یا تجھے کوئی خطرہ ہے کہ میں تنہائی میں تجھے کوئی گزند پہنچاؤں گا۔ میں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک ایسے دیوبندی دارالعلوم میں پڑھتا ہوں جہاں علمائے دیوبند کو معیارِ حق و باطل سمجھا جاتا ہے اور علامہ صاحب کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اُن کا تعلق خوارج کے ساتھ ہے۔ میرے یہ الفاظ سن کر وہ بات کی تہہ کو پہنچ گئے۔

انہوں نے کہا کہ تمہارا اسلوب بہت حکیمانہ ہے۔ اس چھوٹی عمر میں اس قدر احتیاط کرنے کی پالیسی پر تمہاری طرف سے تمہارا یہ طرزِ عمل بہت پسند آیا ہے۔ لہٰذا آج کیا تم کوئی کتاب چاہتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ اُنہوں نے مجھے خطبات کا پہلا حصہ دے دیا۔ میں نے اپنا یہ معمول بنالیا کہ میں درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ مودودی صاحب کی کتابوں کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے طور پر ترجمان القرآن کا چندہ بھی بھیج دیا اور وہ مجھے باقاعدگی سے ملنے لگا۔ اس طرح چھ ماہ میں میں نے علامہ مودودی صاحب کی تقریباً تمام مطبوعہ کتب کا مطالعہ مکمل کر لیا اور ترجمان القرن کے ساتھ ساتھ میں نے دیوبند سے شائع ہونے والے ماہنامے تجلی جس کے ایڈیٹر اُس وقت عامر عثمانی تھے اُس کا بھی باقاعدگی سے مطالعہ شروع کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے ماہنامہ فاران کہ جس کے ایڈیٹر ماہر القادری تھے۔ اُس کے کچھ پرچے ملے اور میں انہیں لے کر دار العلوم پہنچ گیا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جناب پرنسپل صاحب اچانک میرے کمرے میں آئے اور فرمایا کہ تم مودودیے ہو گئے ہو۔ ہمارے شیخ الحدیث اور عظیم استاذ علامہ حسین احمد مدنی کے نزدیک جماعت اسلامی کا بانی مودودی ایک زندیک اور اہلِ خوارج کا ایک فرد ہے۔ اگر تم نے ہمارے مدرسے میں پڑھنا ہے تو مودودی افکار سے توبہ کرو ورنہ ہم تمہیں اپنے مدرسے سے نکال دیں گے۔ میرا خیال یہ تھا کہ مجھے اپنے اس استاذ سے غیر معمولی محبت تھی میں انہیں اپنے ماں باپ سے بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ میری حالت یہ تھی کہ میں اُن کی اور اُن کی اولاد کی خدمت کرنے کو اپنے لیے ایک شرف ہی نہیں بلکہ عبادت کا عمل گردانتا تھا۔ میں سرما ہو یا گرما صبح ساڑھے تین بجے اُن کا کرمنڈل لے کر اوکاڑہ سٹیشن پر پہنچ جاتا تھا وہاں ایک گاڑی فوجیوں کے لیے دودھ لے کر گذرا کرتی تھی۔ اور اس گاڑی کے ایک ڈبے میں شہریوں کے لئے دودھ خریدنے کی سہولت موجود تھی۔ یہ دودھ خالص بھی ہوتا تھا اور کم قیمت بھی۔ اور اس کو خریدنے والے بہت کم ہوتے تھے اس لئے اس میں کوئی رش یا ہجوم سے بھی نہیں گذرنا پڑتا تھا۔ عام طور پر میں یہ برتن رات ہی کو لے لیتا تھا اور نمازِ فجر سے پہلے یہ دودھ لیتا اور لے کر اسے استاذ محترم کے گھر کے بیرونی دروازے پر رکھ دیتا اور پھر گھنٹی دیتا اور استاذِ محترم کی اہلیہ کہ جنہیں میں اپنی مادرِ مہربان کا مقام دیتا تھا وہ اسے اُٹھا کر لے جاتیں اور پھر میں نمازِ فجر کے بعد استاذِ محترم کے درسِ قرآن میں شامل ہو جاتا۔ یہی نہیں بلکہ استاذِ محترم کے لئے چکی سے آٹا پسوا کر لانا اور اُن کے لئے ایندھن کو اپنی پشت پر رکھ کر ٹال سے لانا اور اسے چیرنا اور سودا سلف بازار سے لا کر گھر پہنچانا اور گرمیوں میں بڑے چھ مَٹ پانی سے بھرنا اور جہاں استاذِ محترم اور اُن کے اہل و عیال سوتے تھے اُس چھت پر پانی کا چھڑکاؤ کرنا میں اپنے لیے وجہِ سعادت سمجھتا تھا۔ استاذِ محترم سے مجھے اس حد تک لگاؤ تھا کہ جب استاذ صاحب عصر کے بعد اپنے بچوں کو لے کر باہر سیر و سیاحت کے لئے جاتے تو مجھے اپنے ساتھ بلا لیتے۔ میں اُن کے ایک یا دو بچوں کو اپنی پشت یا کندھوں پر سوار کر لیتا اور اس آنے جانے کے دَوران میں ان بچوں کو اس طرح اپنے اوپر سوار کرنا اپنے لئے بہت بڑی سعادت سمجھتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ استاذِ محترم کو بھی مجھ سے اپنے بچوں کی طرح پیار تھا حتیٰ کہ اُن اہلیہ محترمہ بھی مجھے اپنا بچہ ہی سمجھتی تھی اگر میرے اور اُن کے مابین شرعی حجاب حائل رہتا تھا۔ علامہ مودودی صاحب کے اس مطالعے کے بعد اُستاذِ محترم نے جس ردِ عمل کا اظہار کیا میرے لیے وہ ایک انتہائی غیر متوقع امر تھا میں نہ سمجھ سکا کہ آخر علمائے دین کے مابین اس قدر نفرت کیوں ہے اور میرے چھوٹے سے دماغ میں یہ بات نہ بیٹھ سکی کہ صرف علمائے دیوبند ہی کیوں معیارِ حق کیوں ہیں اور علامہ مودودی صاحب کو کس بنیاد پر زندیک و خارجی ٹھہرایا جا رہا ہے۔ بہر حال

استاذِ محترم میرے ہاں سے فاران اور تجلّی کے تمام پرچے اُٹھالے گئے اور فرمایا کہ ہم ان کا مطالعہ کریں گے اور پھر تجھے سچ جھوٹ سے آگاہ کریں گے لیکن ہمارا پہلا تقاضا یہ ہے کہ تم مودودیت سے توبہ کرو اور عہد کرو کہ آئندہ تم کبھی بھی مودودی صاحب کی کوئی کتاب نہ پڑھو گے۔ اچھی طرح سُن لو کہ اگر تو نے مودودیت سے توبہ نہ کی اور آئندہ کے لئے یہ حلف نہ اُٹھاؤ گے کہ تم کبھی بھی مودودی صاحب کا اور اُن سے ہمنوا مصنفوں پبلشروں اور ایڈیٹروں کی کوئی کتاب کوئی پمفلٹ اور کوئی رسالہ نہیں پڑھو گے۔ لیکن اگر تم نے نہ توبہ کی نہ آئندہ کے لئے حلف اُٹھایا تو یاد رکھو تم ہمارے اس مدرسے میں دو دن بھی نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ہم تو تم پر اسی لیے محنت کی ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد علمائے حق دیوبند سے وابستہ تھے۔ اگر ہمیں پہلے ہی دن تم بتادیتے کہ تم اپنے دیوبندی آباؤ اجداد سے منحرف ہو اور مودودیت تمہاری رگ رگ میں رچ بس چکی ہے تو بخدا ہم تمہیں صرف نحو اور فقہ اور ترجمہ قرآن میں سے ایک لفظ بھی نہ پڑھاتے۔ اُستاذ صاحب کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا اور میں ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اس دوران ایسا ہوا کہ ہمارے استاذِ محترم کے ایک اور باغی طالبعلم جو ایک ہائی سکول میں استاذ تھے اور جن کا نام محمد امین صفدر تھا میری اُن سے شناسائی تھی۔ اُن سے میں نے یہ تمام ماجرہ بیان کیا۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ ہمارے استاذِ محترم بہت عالم و فاضل انسان ہیں۔ فقہ اور منطق میں بہت زیادہ درک حاصل ہے۔ لیکن افسوس کہ ان میں وسعتِ ظرف نہیں ہے۔ اور طلباء کو بات سمجھانے کی بجائے اُن پر تحکّم کے ذریعے اپنا فیصلہ نافذ کرتے ہیں۔ میں بھی اُن کے اسی تحکّم کی وجہ سے اُن کی بارگاہِ عالی سے دھتکارا ہوا انسان ہوں اور میرے بارے میں بھی انہوں نے یہی فرمایا ہے کہ اگر میں نے توبہ نہ کی تو میں ملحد و زندیق کی موت مروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے الحاد و زندقہ سے بچائے رکھے اور خدانہ کرے کہ میں کبھی بھی الحاد و زندقہ میں مبتلا ہو کر مروں۔ اور میں استاذِ محترم کے کتنے ہی شاگردوں کو جانتا ہوں جو بہت اچھے اور محنتی طالبعلم تھے۔ لیکن استاذِ محترم نے اسی طرح سختی کا رویہ اختیار کر کے اُنہیں اپنا باغی بنا کر اپنے ہاں سے دھتکار کر نکال دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ استاذِ محترم کی اُن کے بارے میں پیشین گوئیاں سب جھوٹی ثابت ہوئیں اور اُس وقت کے طلباء آج علمائے دیوبند کی صفوں میں بہت عزت و احترام کا مقام رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ استاذِ محترم بھی اُنہیں اپنا شاگرد کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا استاذ صاحب کے اس طرزِ عمل سے دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں البتہ مودودی صاحب کا مطالعہ اس طرح نہ کرو کہ اُنہیں حق و باطل کا معیار مان لو بلکہ اپنے اندر حق اور باطل کو پہچاننے کا اپنے اندر ملکہ پیدا کرو۔ میں نے دیکھا ہے کہ تم قرآنِ حکیم بہت اچھی طرح سمجھنے لگے ہو لہٰذا تمہیں ان چیزوں کے مطالعے سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ استاذ صاحب سے کہہ دو کہ وہ جس چیز کو غلط سمجھتے ہیں اس کی غلطی تم پر واضح کر دیں اور اس وضاحت کے بعد اس غلط فکر کو چھوڑنے کا اُن کے سامنے برملا اظہار کر دو۔ کئی دنوں کے بعد ایسا ہوا کہ استاذ صاحب نے مجھے کافی غمگین پایا فرمایا کہ کفایت اللہ تم بہت پریشان نظر آتے ہو۔ میں نے کہا کہ جب سے مودودی صاحب کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ وہ ملحد و زندیق انسان ہیں اُس دن سے میری طبیعت اچاٹ ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ کھانے پینے کی چیزوں سے بھی میرا دل اُٹھ گیا ہے۔ فرمایا ہم اُن رسالوں کو پڑھ رہے ہیں جو تجھ سے لیے تھے اور کچھ دنوں کے بعد ہم تجھے وہ واپس کر دیں گے اور بتادیں گے کہ اُس میں کیا کچھ غلط ہے۔ پھر تم اُنہیں ہمارے سامنے جلا دینا کیونکہ ایسی گندی چیزوں کو ہم اپنے مدرسے کے ماحول میں برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے عرض کیا کہ اُن کتابوں اور رسالوں میں قرآنی آیات ہیں، احادیثِ

نبویہ ہیں اور کچھ آئمہ سلف کے اقوال ہیں اور پھر ان سب کی روشنی میں اُنہوں نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا ان چیزوں کو ہم گند کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ استاذ صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا لیکن کسی ناگواری کا اظہار زبان پر نہ آنے دیا فرمایا اچھا کچھ دنوں کے بعد اس پر بات کریں گے ابھی تم مودودیت سے توبہ کر لو اور آئندہ کے لئے حلف اُٹھاؤ کہ ایسی چیزیں نہ تو پڑھو گے اور نہ ہی انہیں مدرسے میں لاؤ گے۔ میں خاموش ہو گیا اور اسباق میں شرکت جاری رکھی۔ چند دنوں کے بعد ایسا ہوا کہ استاذِ محترم سورہ کہف پڑھا رہے تھے تو انہوں نے ایک رائے کا اظہار کیا کہ یہ بات تو آپ نے پہلے یوشہ بن نون کے حوالے سے کہی تھی اور آج اسے براہِ راست آپ سیدنا خضر کے حوالے سے کہہ رہے ہیں اصل حقیقت کیا ہے۔ استاذ صاحب یہ سنتے ہی جلال میں آ گئے۔ فرمانے لگے مودودیت کا گوسالہ تیرے اندر بہت گہرائی میں اتر چکا ہے اس کے نتیجے میں تیرا ذہن ابھی سے نقد و انتقاد کے مرض میں بہت بری طرح مبتلا ہو گیا ہے اب تجھے اساتذہ کے کلام میں بھی تضاد نظر آنے لگا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تیری مودودیت ناقابلِ اصلاح ہے یہ کہتے ہوئے استاذ صاحب نے تپائی میری طرف پھینکی۔ الحمد للہ میں تو بچ گیا لیکن میرے رفیق غلام حسین کشمیری اس کی زد میں آ کر زخمی ہو گئے اور استاذ صاحب نے پوری کلاس کو درس دینے سے محروم کر دینے کا اعلان کیا اور میرے بارے میں ارشاد فرمایا جب تک تو مودودیت سے توبہ نہیں کرے گا تیرا کھانا پینا مدرسے سے کم از کم چھ ماہ کیلئے بند ہے۔ لہٰذا کل سے میں تجھے اس کلاس میں مت دیکھوں اور نہ ہی لنگر خانے سے تو کھانا حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ توبہ کر اور پھر ہم فیصلہ کریں گے کہ تجھے ہم نے مدرسے میں رکھنا ہے یا تو ہمیشہ کے لئے خارج کر دیئے جانے کا اہل ہے۔ اس فیصلے کے بعد مجھے کافی پریشانیوں نے آگھیرا میں یہ سوچنے لگا کہ ہماری مذہبی دنیا میں اس عدم برداشت کا سبب کیا ہے اور علماء کے مابین اس حد تک ایک دوسرے سے اختلاف نفرت و اکارت کیوں پائی جاتی ہے۔ دلیل و برہان سے اپنی بات منوانے اور دوسرے کا مؤقف سننے کے ہم کیوں روادار نہیں ہیں۔ اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ میں اندھی تقلید کی بنیاد پر اپنے آپ کو دیوبندی سمجھے ہوا تھا اور جب میں نے مودودی صاحب کے افکار و تصورات کو پڑھنے کی کوشش کی اور دلیل و برہان سے کام لینے کی انہوں نے دعوت دی تو آخر اس میں کیا قباحت ہے اور میرے اساتذہ اس قدر کیوں تنگ نظر ہیں اور اُن میں اس امر کا کیوں حوصلہ نہیں پایا جاتا کہ وہ اپنے ایک ایسے شاگرد کو جو انہیں ماں باپ سے بڑھ کر محترم سمجھتا ہے اور اُن کی بات کو اب تک اندھوں بہروں کی طرح مانتا رہا ہے تو آج اگر وہ کسی بات کے بارے میں یہ سوچنے لگا ہے کہ اسے دلیل و برہان کی بنیاد پر مانے اور جو مؤقف دلیل و برہان کو استعمال کرنے کی دعوت دے رہا ہے اُسے وہ اندھی تقلید کی بنیاد پر کیسے رَد کر دے۔ اس صورتِ احوال میں دن کا سکون اور رات کی نیند غائب کر دی اور اس ذہنی کشمکش نے اُس کی کھانے پینے کی طلب کا بھی خاتمہ کر دیا۔ آخرِ کار ایسا ہوا کہ اس معاملے کی خبر بعض ایسے نمازیوں کو پہنچ گئی جن کا اس مدرسے کو چندہ دینے اور مالی تعاون کرنے میں کافی ہاتھ تھا۔ ان میں سے کچھ بااثر افراد مہتمم صاحب کے پاس پہنچے اور اُن سے کہا کہ ایک طالبعلم کو صرف اس بنیاد پر روٹی سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے کہ جس نے اپنے استاذ سے کسی معاملے میں کسی دلیل کا مطالبہ کیا ہے اور کیا آپ کے اساتذہ دلیل و منطق کے حوالے سے اس قدر کمزور ہیں کہ وہ اپنے زیرِ تربیت طلباء کے سوالات کا جواب نہیں دے سکتے۔ مہتمم صاحب نے اُن سے وعدہ کیا کہ وہ ایک دو دن میں استاذ صاحب سے مل کر اس معاملے کی تحقیق کر لینے کے بعد انہیں جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ اگلے دن انہوں نے استاذ صاحب

سے اس تمام صورتِ احوال کے بارے میں استفسار کیا۔ استاذ صاحب نے اسے اپنی توہین سمجھا اور فرمایا اگر میں نے اپنے ہی طالبعلم سے اُس کے کسی نالائقی کی وجہ سے روٹی بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو عمائدین کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ اس بارے میں مجھ سے جواب طلب کریں۔ مہتمم صاحب نے کہا کہ آپ کی بات کو اگر مان لوں تو وہ عمائدین مجھ سے پوچھیں گے کہ اس بچے سے آخر کونسی ایسی نالائقی سرزد ہوئی ہے جس کی پاداش میں اس کا کھانا پینا چھ ماہ کیلئے بند کر دیا گیا ہے۔ نالائقی اور اس کی سزا کے مابین کوئی منطقی مناسبت ہونی چاہئے۔ استاذ صاحب کو اس پر غصہ آگیا اور فرمایا کہ اگر اس طرح کی جرح و تفتیش کا دروازہ آپ نے کھول دیا تو آپ کے ہاں کوئی بھی استاذ کام نہیں کرے گا کیونکہ یہ اساتذہ کی توہین ہے کہ اُن سے ایسے فیصلوں کے بارے میں جواب طلب کیا جائے اور فرمایا کہ اگر میرے اور میرے طالبعلم کے مابین برابری کا یہ طرزِ عمل جاری رہا اور مجھے میرے طلباء پر تفوق و برتری کو تسلیم نہ کیا گیا تو وہ یہ مدرسہ چھوڑ کر کسی اور مدرسے میں چلے جائیں گے کیونکہ تمام مدارس میں میری بطورِ معلم و مدرس دھاک بیٹھی ہوئی ہے مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں جہاں کہیں بھی چلا جاؤں ہاتھوں ہاتھ لیا جاؤں گا اور میری تنخواہ بھی اس سے کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ مہتمم صاحب یہ سُن کر خاموش ہو گئے اور انہوں نے ایک دو دن تک عمائدین کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسا ہوا کہ میں ایک دن نمازِ مغرب کے بعد پریشانی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پاس رانا عبد الحئ جو ایک اچھے مالدار آدمی تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا تم وہی طالبعلم ہو جس کی روٹی بند کر دی گئی ہے ۔ میں نے کہا جی ہاں۔ انہوں نے کہا آج سے تم میرے ساتھ گھر کھانا کھانے کے لئے ساتھ چلو یا اگر یہ مناسب نہ سمجھو تو میں یہ کھانا تمہارے پاس اپنے ملازم کے ہاتھ بھیج دیا کروں گا۔ میں نے کہا کہ شام کو کھانا کھانے کیلئے تو میں آپ کے ساتھ ہی جانا پسند کروں گا البتہ دوپہر کا کھانا اگر آپ بھیج دیا کریں تو مناسب رہے گا۔ استاذ صاحب کو جب اس امر کی خبر ہوئی کہ ہم نے تو دال روٹی بند کی ہے اور اسے یہ اعلیٰ خاندان کی طرف سے کھانے کی پیشکش ہو گئی ہے تو انہوں نے فوراً میرا کھانا لنگر خانے سے بحال کر دیا لیکن رانا صاحب کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے کہا کہ کم از کم چالیس دن تک تو ایسا نہیں ہو گا اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی جماعتِ اسلامی کے بعض ارکان کو اس امر کی خبر پہنچ گئی۔ انہوں نے بھی مہتمم صاحب سے اس صورتِ احوال پر احتجاج کیا اور اسے علماء کی تنگ نظری قرار دیتے ہوئے انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اتنے میں وہ عمائدین مہتمم صاحب کے پاس جا پہنچے اور انہوں نے پوچھا کہ اس معاملے کا کیا بنا۔ انہوں نے تمام صورتِ احوال اُن کے سامنے بیان کر دی تو عمائدین نے کہا کہ ایسے مدرسے کو چندہ دینے اور اس کے ساتھ اقتصادی تعاون کرنے میں کیا بھلائی ہے جہاں طلباء کے ساتھ اس طرح زیادتی کی جاتی ہے اور دلیل و منطق سے کام لینے کے اساتذہ بالکل روادار نہیں ہیں۔ اس تمام صورتِ احوال کی اطلاع استاذ صاحب کو ہوئی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے مہتمم صاحب سے احتجاج کرتے ہوئے فرمایا کہ اب یا تو اس طالبعلم کو اس مدرسے سے جانا ہو گا یا پھر میں اس مدرسے سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ مہتمم صاحب نے فرمایا کہ اتنا بڑا فیصلہ اتنی چھوٹی بات پر آپ کو زیب نہیں دیتا۔ بہر حال طالبعلم کو تو ہم نہیں نکال سکتے کیونکہ عمائدین اس صورتِ احوال سے باخبر ہو چکے ہیں وہ اس سے سخت ناراض ہوں گے اور اُن کی جانب سے جو تعاون اور اقتصادی امداد مدرسے کو مل رہی ہے وہ بالکل بند ہو جائے گی اور اس طرح ہمیں مدرسہ بند کرنا پڑے گا۔ اور اگر آپ نے اس بات پر اصرار جاری رکھا تو آخرِ کار بادلِ نخواستہ ہمیں آپ سے یہی التجا کرنی پڑے گی کہ یا تو آپ یہ انتہا پسندانہ

فیصلہ واپس لے لیں اور اس طالبعلم کو معاف کر دیں۔ آئندہ کے لئے وہ آپ سے کوئی ایسا سوال نہیں کرے گا جس سے آپ ناراض ہو جائیں۔ استاذ صاحب نے فرمایا معافی ممکن نہیں کیونکہ اس سے دوسرے طلباء پر بھی بُرا اثر پڑے گا اور اساتذہ کے احترام میں بھی کمی آجائے گی لہٰذا بہتر یہی ہے کہ میں خود ہی اس مدرسے کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ استاذ صاحب یہ کہہ کر دس دن کی چھٹی لے کر کہیں باہر چلے گئے۔ تین دن کے بعد تشریف لائے اور فرمایا ہم نے جامعہ مدنیہ لاہور میں ملازمت اختیار کر لی ہے اور ہم دو چار دنوں میں لاہور چلے جائیں گے۔ مجھے اُن کا یہ فیصلہ سُن کر بے پناہ تکلیف ہوئی۔ میں رات اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے یوں عرض کی کہ آپ میرے لئے ماں باپ کی طرح محترم ہیں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ آپ ہی کی عطا ہے۔ لہٰذا آپ مجھے معافی عطا کر دیں اور اس مدرسے کو چھوڑنے کا فیصلہ ملتوی کر دیں۔ انہوں نے فرمایا اوّل تو وہ معاف نہیں کریں گے اور اگر معاف کر بھی دیں تو وہ لاہور جانے کے فیصلے کو موقوف نہیں کریں گے کیونکہ عمائدین نے جس طرح اُن کے حقوق کو پامال کیا ہے وہ اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں لہٰذا وہ توہین کروا کر اس ماحول میں زیادہ دیر تک کام نہیں کر سکتے۔ میں نے اس فیصلے کو تبدیل کروانے کے لئے بہت منت سماجت کی لیکن استاذ کسی قیمت پر راضی نہ ہوئے اور ٹھیک دو دن کے بعد میں نے دیکھا کہ صوفی رفیق صاحب ایک ٹرک لے آئے ہیں اور جنابِ استاذ صاحب کا سامان اس کے اوپر لادا جا رہا ہے۔ میں بہت رویا اور میں نے اسی حالت میں استاذ صاحب کا سامان ٹرک میں لادنے میں شامل ہو گیا لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد استاذ صاحب یہاں سے لاہور جانے کیلئے بمع اپنے بچوں کے ٹرک میں سوار ہونے کیلئے تشریف لے آئے اور رونے کی حالت میں میں نے استاذ صاحب کو الوداع کہا۔ چند منٹوں میں استاذ صاحب کا ٹرک آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے دل دماغ پر اس کا بہت منفی اثر ہوا۔ لہٰذا میں نے بھی سوچا کہ اب مجھے اس مدرسہ سے کسی دوسرے مدرسے میں چلا جانا چاہئے۔ لیکن جاؤں تو جاؤں کہاں۔ عجیب تکلیف دہ صورت احوال تھی۔ آخر میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس تما م صورتِ احوال سے علامہ مودودی صاحب کو آگاہ کروں اور اُن سے رہنمائی لے کر کسی مدرسے میں جانے کا فیصلہ کروں۔ اس مدت میں میرا چوتھا تدریسی سال اختتام کو جا پہنچا اور اس طرح موقوف علیہ دَورہ پر پہنچ گیا۔ میں نے اس تمام صورتِ احوال کی وضاحت کرتے ہوئے جو خط علامہ مودودی صاحب کی خدمتِ اقدس میں ارسال کیا تھا چند ہی دنوں میں مجھے اس کا جواب موصول ہو گیا۔ انہوں نے مجھے جامعہ العلوم ملتان، قاسم العلوم سرگودھا اور اسی طرح سندھ کے کسی منصورہ مدرسے میں سے کسی ایک میں داخلے کی تجویز دی تھی۔ میں نے رمضان المبارک کے بعد جامع العلوم ملتان میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جونہی رمضان المبارک گذرا میں نے جامع العلوم ملتان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن وہاں کیسے پہنچا جائے کیونکہ میرے پاس گذرِ اوقات تو کجا وہاں تک پہنچنے کا کرایہ بھی نہ تھا۔ میں نے اپنے کفیل چچا سے اس بارے میں مشورہ کیا انہوں نے فرمایا کہ تمہارا اتنی دُور جانا اور وہاں کے تعلیمی اخراجات کو برداشت کرنا میری مالی استطاعت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اوکاڑہ یا ساہیوال کے کسی مدرسہ میں داخل ہو جاؤ اور وہیں پر اپنی دینی تعلیم مکمل کر لو۔ میں نے عرض کیا کہ میں ملتان جانے کا پختہ ارادہ کر چکا ہوں۔ آپ صرف مجھے وہاں تک پہنچنے کا ایک طرف کا کرایہ دے دیں باقی میرا اللہ حافظ ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہاں جا کر میں ناکام نہیں ہوں گا۔ انہوں نے مجھے پانچ روپے عنایت فرمائے جس میں سے کرایہ تو شاید دو ڈھائی روپے ہو گا بقیہ میرے لیے جیب خرچ تھا۔ میں ایک چھوٹی سی صندوقچی اور ایک ہلکا سا بستر سر پر رکھ کر عازمِ

ملتان ہو گیا۔ ہرے کی بس سروس کے ذریعے میں جب ملتان پہنچا تو عشا کی نماز ہو چکی تھی لاری اڈے پر کافی حد تک خاموشی تھی کیونکہ بسیں اپنے اپنے روٹس سے واپس آ کر اپنے اپنے شیڈ میں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ میں ایک ہوٹل میں پہنچا وہاں چائے پی اور چند ایک رس کھائے اور پھر سامان لے کر قریب ہی ایک مسجد میں جا پہنچا نمازِ عشاء پڑھی اور صندوقچی ایک سائیڈ پر رکھ کر اور بستر ے کو سر کے نیچے رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی میں سویا نہیں تھا کہ اچانک ایک کالے سیاہ لباس میں ملبوس ایک کالا سیاہ ملنگ میرے پاس آ کر لیٹ گیا۔ اس کے چہرے مہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی اور مزید براں یہ کہ اُس کا کالا سیاہ کتا بھی وضو گاہ کے پاس ہی میری طرف پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ مجھے اس صورتِ احوال نے بہت خوفزدہ کر دیا۔ مجھے طرح طرح کے خیالات آنے لگے کہ تو سفر میں تنہا ہے۔ پورے شہر میں تیری کوئی جان پہچان نہیں اور نہ ہی جامع العلوم والوں کو اطلاع ہے کہ تو اُن کے پاس آ رہا ہے۔ اگر اس حالت میں یہ ملنگ تیرا گلا دبا دے اور اس صندوقچی اور بستر ے پر قبضہ کر کے اسے راتوں رات اُٹھا کر کہیں چلا جائے تو تیرا کیا بنے گا۔ میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اچانک میرے دماغ پر اس احساس کا قبضہ ہو گیا کہ اے کفایت اللہ تو اپنے مالک و نگہبان اللہ سے کیوں مایوس ہو گیا ہے۔ جس خدائے مہربان نے تجھے ہندوستان سے تنِ تنہاء پاکستان اپنی حفاظت میں پہنچایا ہے اور جس نے یتیمی کے باوجود قدم قدم پر تیری مدد اور نگہبانی کی ہے تو کیا وہ حیّ و قیوم تیری مدد نہیں کرے گا اور کیا وہ اس ملنگ سے تیری حفاظت کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں نہایت اطمینان کے ساتھ تمام تفکرات سے بالکل مطمئن ہو کر سو گیا۔ مجھے جب جاگ آئی تو اذانِ فجر ہو رہی تھی اور جب میں دائیں بائیں دیکھا تو نہ کہیں کالا کلوٹا ملنگ تھا اور نہ ہی اس کا کتا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کب رات اُٹھا کر مسجد سے چلا گیا۔ میں نے نہایت خوشگوار اور میٹھی نیند میں رات گزاری۔ اُٹھ کر وضو کیا اور فوراً سنتیں پڑھ کر نمازِ فجر کی جماعت کا انتظار کرنے لگا۔ جونہی جماعتِ فجر سے فراغت ملی تو میں نے درسِ قرآن کا اعلان کر دیا۔ امام اور نمازیوں کے چہروں پر انتہائی حیرانگی کے جذبات و احساسات محسوس ہوئے۔ گویا انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ یہ چودہ پندرہ سال کا بچہ کیا درسِ قرآن دے گا۔ وہ سب میرا تماشا دیکھنے کے لئے مسجد میں بیٹھ گئے اور مولوی صاحب نے بھی قرآن میری طرف بڑھا دیا اور فرمایا لو دو درسِ قرآن۔ گویا انہیں یقین نہیں تھا کہ میں درسِ قرآن دے سکوں گا۔ میں نہایت اطمینان سے امام صاحب کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا قرآن کھولا اور سورہ البقرہ کا چوتھا رکوع نہایت سادہ انداز میں پڑھا۔ پڑھنے کے بعد میں نے ذرا سا توقف کیا اور اپنے سامعین کے چہروں پر نظر دوڑائی تو پتہ چلا کہ وہ سب یقین رکھتے ہیں کہ میں بالکل درس نہیں دے سکوں گا اور ایسے ہی میں نے اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کا ڈھونگ رچایا ہے۔ بہر حال ایک دو منٹ کے بعد میں نے درسِ قرآن کا آغاز کر دیا۔ پہلے تو زیرِ درس آیات کا بامحاورہ ترجمہ کیا پھر ان آیات میں پائے جانے والے بنیادی الفاظ پر عربی لغات کی رو سے تجزیہ و تحلیل کی اور پھر مقامِ خلافت پر درس دینا شروع کر دیا۔ آدم کی خلافت کا راز علم اُدم الاسماء کی صلاحیت کو قرار دیا اور پھر کہا کہ خلافت اُسے نہیں ملتی جو کسی دوسرے شخص کے ساتھ نسلی یا خونی قرابت داری رکھتا ہو۔ اور نہ ہی اسے ملتی ہے جو مقامی قرب رکھتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو خلافت ملائکہ کو ملتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نزدیکی اور قرب کا مقام رکھتے ہیں لیکن آدم جو نزدیکی اور قرب کا حامل نہیں تھا لیکن علمی صلاحیت میں ملائکہ سے بڑھ کر تھا اُس کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا۔ میں نے کہا کہ اس اصول سے پتہ چلتا ہے کہ اس امت میں بھی یہی اصول کار فرما ہونا چاہئے۔ خلافت کے اہل قرابت دار اہل و

عیال اور رشتہ دار نہیں ہوتے بلکہ قرابتِ قریبہ کا اہل وہی ہوتا ہے جو علمی اور تعلیمی صلاحیتوں کا مالک ہو خواہ وہ خونی یا نسلی رشتے میں بعید تر ہی کیوں نہ ہو۔ پھر میں نے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے خلافت کے باب میں افکار و تصورات پر نقد و انتقاد کیا اور اہلِ سنت کے خلافت کے باب میں جو دلائل و بینات ہیں اُنہیں نہایت پر جوش طریقے سے بیان کیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ملتان میں اہلِ تشیع کا کافی غلبہ ہے اور اہلِ سنت اور ان کے مابین مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔ جب میں نے درس ختم کیا تو ہر طرف سے داد و تحسین کے جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ مولوی صاحب تم یہیں ہمارے ہاں امامت و خطابت کرو ہم تمہاری بہت خدمت کریں گے۔ میں نے کہا کہ میں یہاں امامت و خطابت کرنے نہیں آیا۔ اگر امامت و خطابت میں نے کرنا ہوتی تو اوکاڑہ میں اس کے بے پناہ امکانات موجود تھے۔ میں تو انہیں تج کر ملتان اگلی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے آیا ہوں اس لئے تم بس یہ کرو کہ مجھے مدرسہ دار العلوم کا راستہ بتا دو۔ جب میں نے جامع العلوم کا نام لیا تو ایک داڑھی والے بزرگ میرے قریب تشریف لائے۔ انہوں نے فرمایا اُن کا نام محمد اسلم ہے اور وہ جامع العلوم ملتان ریاضی کے ٹیچر ہیں۔ انہوں نے فرمایا مولوی صاحب میرا گھر قریب ہی ہے آپ میرے ساتھ گھر چلیں ہم ناشتہ کر کے دونوں سات بجے تک جامع العلوم جا پہنچیں گے۔ میں مسجد سے اُٹھ کر اُن کے ساتھ ہو لیا۔ ناشتہ کر کے ہم جامع العلوم کی طرف نکلے۔ اُن کے پاس بہت مضبوط بائیسکل تھی۔ انہوں نے میری صندوقچی اور بستر اسائیکل کے پیچھے کیریئر پر بہت مضبوط طریقے سے باندھ لیا اور مجھے سائیکل کے اگلے ڈنڈے پر بیٹھا کر جامع العلوم کی طرف چل دیئے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک چلنے کے بعد ہم جامع العلوم پہنچ گئے۔ جب ہم پہنچے تو صبح کی اسمبلی کا آغاز ہو چکا تھا تھوڑی دیر میں اسمبلی ختم ہوئی اور تمام طلباء اپنی اپنی کلاسوں میں پہنچ گئے تو میں یہ سب کچھ نہایت غور سے دیکھتا رہا اور پھر پرنسپل کے کمرے کی طرف آگے بڑھا۔ پرنسپل صاحب کے مددگار سے میں نے اپنے داخلے کے بارے میں بات کی انہوں نے کہا کہ اب داخلہ ممکن نہیں۔ کیونکہ یہاں داخلہ کا ٹائم مارچ آخری ہفتہ ہوا کرتا ہے اور آج تو اپریل کی چار یا پانچ تاریخ ہے۔ جن کا داخلہ ہونا تھا وہ داخلہ وہ چکا اب تمہارا داخلہ کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے پرنسپل صاحب کے پاس جانے دو۔ انہوں نے کہا کہ پرنسپل صاحب کے پاس جانا فضول ہے۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا ہے جو میں دے چکا ہوں۔ بڑی منت سماجت کے بعد انہوں نے مجھے پانچ منٹ دیئے اور کہا ان کے اندر اندر پرنسپل صاحب سے فارغ ہو کر واپس آ جاؤ۔ میں اُن کا شکریہ ادا کیا اور پرنسپل صاحب کی چٹ اُٹھا کر اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا بیٹے کیا بات ہے۔ کیا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کیا داخلہ۔ فرمایا داخلے تو ہو چکے تم لیٹ آئے ہو اب تو کلاسیں شروع ہو چکی ہیں۔ میں نے کہا مجھے داخلے کے بارے میں یہ آگاہی نہ تھی کہ یہ داخلہ صرف مارچ کے مہینے میں ہوا کرتا ہے۔ میں تو اس امید پر آیا تھا کہ دینی مدارس میں داخلے شوال کے دوسرے ہفتے تک جاری رہتے ہیں۔ اور ابھی آج تو پانچ شوال ہے۔ تو میرا داخلہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کہا مجھے امید ہے کہ آپ میرا داخلہ ضرور کر لیں گے کیونکہ جو میں سفارشی خط اپنے بارے میں لے کر آیا ہوں آپ اسے کسی قیمت پر رد نہیں کر سکتے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ کیا سفارشی خط ہے جسے میں رَد نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ یہ علامہ مودودی صاحب کا خط ہے۔ فرمانے لگے کہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ علامہ صاحب کو تمہارے یا کسی اور کے داخلے سے کیا غرض؟ جب اس بات نے طول پکڑا تو انہوں نے فرمایا لاؤ دکھاؤ تمہارے پاس کیا سفارشی خط ہے جسے میں رد نہیں کر سکتا اور تجھے اس کالج میں داخل کرنا میرے

لیے لازمی ہے۔ میں نے آہستہ سے وہ خط نکالا اور جنابِ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پرنسپل صاحب کو امید نہ تھی کہ علامہ صاحب میرے داخلے کی سفارش کیلئے کوئی ایسا پرجوش خط لکھیں گے۔ انہوں نے خط بار بار الٹ پلٹ کیا۔ علامہ صاحب کے دستخط پہچاننے کی کوشش کی اور انہیں جلد ہی یقین آ گیا کہ یہ خط اصلی ہے اور واقعی علامہ صاحب کے دستخطوں سے جاری ہوا ہے۔ پرنسپل صاحب یہ جان کر کہ یہ خط واقعی اصلی ہے کھڑے ہو گئے۔ اور مجھے گلے لگا کر فرمایا کہ اگر تمہارا داخلہ میں نہیں کروں گا تو کس کا داخلہ کروں گا۔ تم تو ہمارے پیر و مرشد اور امیر جماعت اسلامی علامہ مودودی صاحب کے کوئی خاص آدمی ہو۔ تمہارا داخلہ تو ہم پر واجب ہے بلکہ داخلے کے ساتھ ساتھ تمہارے لیے تمام قیام وطعام کے انتظام کرنا بھی ہماری ڈیوٹی ہے۔ خط لے کر اپنے کلرک کو دیا اور کہا کہ اسے ایک خاص فائل میں لگا کر بطور یادگار اسے محفوظ کر لو اور پھر مجھ سے میری سابقہ تعلیم کے بارے سوالات کرنے لگے۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ یہ خط کیسے ملا۔ میں نے تمام پس منظر اور اس کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا